سلسلۂ مطبوعات رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز —

قومی تہذیب اور ہندستانی مسلمان

(۲)

عابد رضا بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

[illegible] دہلی

سلسلۂ مطبوعات امپورانسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۔ ۲۰

۳

قومی تہذیب اور ہندستانی مسلمان

مولانا آزاد

ترتیب

اپریل ۱۹۶۸ء کے ایک سیمینار کی روداد جو اپریل ۱۹۶۹ء میں جمال پرنٹنگ پریس، جامع مسجد دہلی میں طبع ہوئی۔

اگوانی صاحب (ڈاکٹر محمد شفیع اگوانی) کی نذر

پیشگفتار

ذیل میں اس مذاکرہ کی روداد پیش کی جارہی ہے جو "Relevance of Maulana to Present Day India" کے عنوان سے پچھلے سال انھیں دنوں میں نئی دہلی میں ہوا تھا جس کی منصوبہ سازی میں ہمایوں کبیر، یونس سلیم، خواجہ غلام السیدین، بشیر حسین زیدی، اروناآصف علی، گوپال داس کھیڑا، میر مشتاق احمد، حکیم عبدالحمید صاحبان کسی نہ کسی مرحلہ پر شریک رہے؛ بیرسٹر نورالدین احمد اور مولانا عتیق صدیقی نے خیال کو عملی شکل عطا کی؛ اور برادرم شہاب الدین انصاری نے کارروائی کو ریکارڈ کرنے میں مدد کی جن کے ٹیپ سے مذاکرہ کی روداد لفظ بلفظ پیش کی جارہی ہے۔

مولانا میں ایسی کیا بات تھی کہ ایسے مواقع پر جن سے ہم سب اس وقت دوچار ہیں سب سے پہلے وہی یاد آتے ہیں؟ مختصراً تو بات اتنی ہی ہے کہ وہ ان اقدار کی بھرپور نمائندگی کرتے تھے جو اس ملک کے لئے خیر و فلاح کا پیغام ہیں اور نجات کی ضامن: رواداری، دوراندیشی، وسعتِ نظر، مشترکہ متحدہ ملے جلے کلچر کی تشکیل، مجسّم اور عقیدۂ وحدتِ خداوندی — وحدتِ آدم

اور انھوں نے ہمیں کیا سکھایا؟ اسے بھی خلاصۃً کہیں تو اتنا ہی ہے کہ مندرجہ بالا اصول ان کے اس ملک کی نجات کے لئے تنہا روشن عملی راستہ اختیار کر لینا چاہئے یعنی: تعالوا الی کلمۃٍ سواءٍ بیننا وبینکم — یا — کم سے کم متفقہ پروگرام مختلف سطحوں پر مسلسل پُرامن اور ہمدردانہ مبادلۂ افکار،

اسلام اور ہندومت کے عقیدہ وعمل کے بارے میں ہندؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی پُر خلوص کوشش، تعلیمی نصاب کا سیکولرائزیشن — اور — بلا جھجک سچی بات بے دھڑک کہہ ڈالنا!

اور یہ سچی بات وہ صرف مسلمانوں سے نہیں ہندوؤں سے بھی کہہ دیتے تھے۔ وہ سچی بات ابھی تک موجود ہے — اور وہ یہی کہ سوال صرف مسلمان کا نہیں، اس پورے ملک کو بچا لیجانے کا ہے اور وہ گلستاں میرے اگر میرا ہم! ہا!" سوال کچھ اقدارِ عالیہ کو بچا لیجانے کا ہے جن کے بنا صرف وحشت کا ناچ ہوگا!!

عابد رضا بیدار

فخرالدین علی احمد

مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں برسی کی تقریب سے یہ جلسہ ہو رہا ہے۔ اس کے لئے جو اصل موقع تھا یعنی فروری، اس وقت کوئی جلسہ نہیں کیا گیا۔ ہر سال اس موقع پر غالباً دہلی پردیش کانگریس کے زیرِ اہتمام، مولانا کے مزار پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور انجمن ترقی اردو دہلی، فاتحہ خوانی کراتی ہے۔ کسی قسم کا جلسہ وغیرہ نہیں کیا جاتا۔ اور آج بھی، میں اپنے دل کی بات کہوں، کہ ہمارے اتنے بڑے نیشنل لیڈر کے سلسلے میں جو سمینار ہوا، اور جو جلسہ ہو رہا ہے، اس میں اس قدر قلیل لوگ شریک ہوں، یہ افسوس کی بات ہے۔ میں مشکور ہوں کہ آپ نے اس ...... سمینار اور جلسہ کے ذریعہ اس طرح مولانا کی یادگار کا ایک طریقہ نکالا ہے۔ مولانا اتنے بڑے، اور ایسی عظیم الشان حیثیت کے انسان تھے کہ آج کے سمینار اور جلسے سے ان کی عظمت میں کوئی اضافہ ہوگا، یہ میں نہیں سمجھتا۔ لیکن جن اصولوں پر وہ چلے، جو راستہ انھوں نے دکھایا، وہ آئندہ نسل کے لئے بھی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ سمینار کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے جب آئندہ نومبر میں بڑا جلسہ ہوگا تو ہم زوروں کے ساتھ ان کی یاد منائیں گے جس میں مولانا کی تمام باتیں اور تمام کام ملک کے سامنے رکھے جائیں گے۔ مولانا کی ہستی ایسی ہستی نہیں ہے کہ ہم صرف ان کے ذکر یا ان کی باتوں سے ان کی عظمت پہچانیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے سورج کے سامنے چراغ جلانا۔ وہ بہت بڑی شخصیت کے انسان تھے۔ مجھے ان سے ملنے، ان سے سیکھنے کا اتفاق ہوا، ان کا میں بہت مشکور رہوں گا، کہ اس سے آج بہت سی دقتوں کا مقابلہ کرنے کی مجھے روشنی ملتی ہے۔

میں جب اسکول میں پڑھتا تھا تو مولانا کو دور سے دیکھا کرتا تھا، جب وہ گلی قاسم جان میں حکیم اجمل خاں کے یہاں آیا کرتے تھے۔ پھر ڈاکٹر انصاری وغیرہ

اور مولانا کی تقریریں سننے کا بھی موقع ملا۔ لیکن ولایت سے آنے کے بعد میں ان سے اچھی طرح ملا۔ کلکتہ میں، میں پریکٹس کرتا تھا۔ میری والدہ فاطمہ بیگم (مولانا کی بہن) کی بہت دوست تھیں وہ مجھ کو لے گئیں کہ چلو مولانا سے ملیں، تو مجھے مولانا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن زیادہ تر ملنے کا اتفاق اس وقت ہوا جب کانگرس منسٹری کے سلسلہ میں وہ گوہاٹی آئے اور منسٹری بنائی۔ پھر میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ممبر ہوا۔ وہ پالیمنٹری بورڈ کے ممبر تھے اس لحاظ سے بھی ہر مہینے ان سے ملنا ہوتا تھا۔

بہت سی باتیں مولانا کی یاد آتی ہیں، لیکن ایک بات بہت اہم مجھے یاد ہے۔ جب لارڈ ویول سے ان کی بات چیت ہو رہی تھی اور ہم سمجھ رہے تھے کہ فیصلہ بغیر پارٹیشن کے ہو جائے گا تو مولانا نے اپنی عظمت سے اتنا بڑا کام کیا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ فیصلہ یہاں آ کے ہوا کہ سنٹر میں مسلمان پچاس فی صدی لے لئے جائیں گے۔ جب ویول سے یہ بات کہی گئی اور جناح صاحب کو ویول نے بتائی تو جناح صاحب نے یہ کہا کہ یہ سارا پچاس فی صدی ریپریزنٹیشن (Representation) مسلم لیگ کا ہوگا۔ گاندھی جی نے کہا کہ ہم اس پر تیار نہیں ہو سکتے، نیشنلسٹ مسلمانوں کو ہم کس طرح قربان کر سکتے ہیں؟ مولانا نے آصف صاحب کو قدوائی صاحب کو اور مجھے بلایا کہ کیا کیا جائے۔ مولانا نے کہا کہ تم بھی گاندھی جی سے کہو اور میں بھی کہ ہم مسلمان آزادی کی راہ میں روڑا نہیں بنیں گے۔ مگر گاندھی جی نے کہا ہم اس پر تیار نہیں۔ لیکن جب پھر مولانا نے کہا تو گاندھی جی بھی تیار ہو گئے۔ اس پر جناح صاحب نے کہا ٹھیک ہے مگر یہ بات مجھے لکھ کر دیں، گاندھی جی بھی، مولانا بھی! اس پر گاندھی جی نے کہا میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی اتنی بے عزتی نہیں کر سکتا۔ تو مولانا آزاد کی یہ تھی عظمت۔

مولانا نے جو کچھ سکھایا اس میں ان کی تین باتیں خاص ہیں جن میں ان کے اصولوں کا نچوڑ بھی ہے۔

ایک یہ کہ، اگر ہمیں وطن سے محبت ہے تو وطن جو بھی قربانی مانگتا ہے ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ مولانا نے سکھایا بھی اور اس پر عمل بھی کیا۔ مولانا نے کیا کام کیا، یہ آپ سب جانتے ہیں۔ جب میں کلکتے میں پریکٹس کرتا تھا مولانا اس زمانے میں عید کی نماز پڑھاتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ مسلم لیگ کے پروپیگنڈے کی وجہ سے لوگوں نے کہا کہ ہم آپ کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے۔ مولانا نے فوراً اپنا منصب چھوڑ دیا۔ پھر جب وہ جیل میں تھے تو ان کی بیوی بیمار ہوئیں سب نے کہا کہ آپ پیرول پر چلے جائیں مگر مولانا نے گوارا نہیں کیا۔

دوسرے، اس ملک کی عظمت اور اچھائی اس میں ہے کہ اتحاد ہو اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

اور تیسرے، جب تک ہمارا ملک آزاد نہیں ہو جاتا ہمارے ملک کے واسطے ترقی کے دروازے بند ہیں، سارے دروازے، علمی و ادبی دروازے بھی۔

اب جب کہ ملک آزاد ہو چکا ہے، اور اب جھگڑا کرانے والا انگریز بھی نہیں ہے — اگر آج ہم ایسے بڑے لیڈر کی وقعت کرتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ان کے اصولوں کو بھی جانیں اور اپنائیں۔ ان کی یاد تازہ کریں، اور اس یاد کے ذریعے جو فائدہ مند باتیں ہیں ان سے فائدہ بھی اٹھائیں۔

ضیاء الحسن فاروقی

آج ہماری قوم جس اخلاقی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے اور ملک کو جو حالات درپیش ہیں ان سے ہر احساس اور دیدہ ور طبقہ واقف ہے، ایسے میں صورت حال پر قابو پانے اور ملک کو حقیقی ترقی، سچی آزادی اور روشن مستقبل کی راہ پر ڈالنے کے لئے ہم مولانا آزاد کی شخصیت، زندگی اور ان کے افکار و خیالات سے کیا روشنی حاصل کر سکتے ہیں، اور روشنی حاصل کر بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر میں نے صحیح سمجھا ہے، تو یہی آج کی بحث کا موضوع ہے۔

میں اسے غیر ضروری سمجھتا ہوں کہ دانشوروں کی اس مجلس میں مولانا آزاد کے حالاتِ زندگی سناؤں، ان کے کمالات کا ذکر کروں جن کے وہ حامل تھے، وہ خوبیاں گناؤں جو ان کی عظمت کے مختلف گوشوں سے متعلق ہیں، ان کے علم و فضل، ان کی فقید المثال خطابت، ان کے قلم کی صلابت، ان کی نورانی فراست، یہ تمام باتیں جانی پہچانی ہیں، ہاں دو ایک باتیں ہیں جن کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا اور وہ یہ کہ فکر و عمل کی جیسی خوشگوار، فعال اور خلاق ہم آہنگی ہمیں مولانا کی شخصیت میں ملتی ہے ویسی شاذ و نادر ہی کسی شخص میں ہوتی ہے۔ فکر و عمل کا اتحاد جب کسی شخصیت کی مرکزی خصوصیت بن جاتی ہے تو اس کے ہاتھوں فکر و نظر کی نئی راہیں کھلتی ہیں، تبدیلی اور انقلاب کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے، زندگی اپنے صحت مند تقاضوں کو پورا کرنے کا عزم کرتی ہے، اور چونکہ جوشِ عمل کے پیچھے فکر کا حزم و احتیاط اور علم کی حکمت اور بالغ نظری ہوتی ہے، اس لئے مجموعی طور پر

اس کا آہنگ مثبت اور تعمیری ہوتا ہے، وہ صرف نفی کا واعظ نہیں ہوتا وہ اثبات کا مبلغ بھی ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مولانا کی یہ خصوصیت آج کی بحث کے دوران آپ اپنے سامنے رکھیں۔

دوسری بات یہ کہ مذہب، فلسفہ، شعر و ادب، فکر و فن، اور تاریخ عالم پر مولانا کی نظر گہری تھی، اُن میں تاریخی نظر بھی تھی، اسی نظر سے اُن پر یہ حقیقت کھُلی تھی کہ اعلیٰ تہذیبی و انسانی قدریں کسی خاص قوم کی امانت نہیں، یہ سب کی ہیں، اور ان کی خدمت دنیا کی تمام متمدن اقوام نے، تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں، اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق، کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس طرح اس تاریخی نظر کی بدولت انسان دوستی سے متعلق اُن کا جو فکر بنا اُسے ہم مولانا آزاد کے ہیومانزم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات بھی ہمارے مدنظر رہے۔

مولانا آزاد ہندستانی مسلمان تھے۔ دوسرے لفظوں میں ہندستانی بھی اور مسلمان بھی۔ انھوں نے بہت کچھ سوچا، بہت لکھا اور بہت بولے۔ اب مکتوبی شکل میں اُن کی جو تحریریں اور تقریریں موجود ہیں انھیں میں ہمیں ان کا فکری مواد ملتا ہے۔ آج کے محدود موضوع بحث کے پیش نظر میں، اس فکری مواد کے دو پہلو آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۔ وہ افکار و خیالات جن کا تعلق پوری ہندوستانی قوم سے ہے۔ ہمارا پورا معاشرہ جس میں مختلف مذاہب، زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کے لوگ رہتے بستے ہیں، ان سب کے میل جول سے ایک مشترک تہذیب تدریجی طور پر پیدا ہوئی اور سب لوگ متحدہ قومیت کے معنوی رشتہ میں منسلک ہو کر ہندستانی قوم بن گئے۔

۲۔ وہ افکار و خیالات جن کا تعلق بظاہر مخصوص طور پر اسلام اور مسلمانوں سے ہے

لیکن بنیادی طور پر ان کا تعلق پوری قوم سے بھی ہے اور اس طرح ہے کہ اگر کوئی طبقہ مذہبی معاملات میں جمود و تعطل اور معاشرتی امور میں علاحدگی پسندی اور ظلمت پسندی کا شکار ہو جائے تو پوری قوم کی متوازن تعمیر و ترقی نہیں ہو سکتی۔

قومیت اور وطنیت کا مسئلہ ہمیشہ سے مسلمانوں میں ایک مختلف مسئلہ رہا ہے۔ جس زمانے میں اس مسئلہ پر کافی ہنگامہ آرائی تھی اُس وقت مسلمانوں کی معتدبہ اکثریت کا اس سلسلہ میں جو خیال تھا اُس کی ترجمانی اقبالؔ کے اس مصرعے سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

"جو پیرہن اس کا ہے وہ ملّت کا کفن ہے"

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے جو موقف اختیار کیا وہ مسلم لیگی قیادت کے شباب کے دور میں مسلمانوں کی اکثریت سے بالکل مختلف تھا اور ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مولانا کے سیاسی رجحان کی تشکیل میں بنگال کے دہشت پسند انقلابیوں کی تحریک کا اولین حصہ تھا۔ بنگال کے انقلابیوں سے اپنے تعلقات کی کہانی مولانا نے ہماری آزادی (India Wins Freedom) میں بیان کی ہے اس کہانی کے ضروری ٹکڑے درج ذیل ہیں۔

"ان دنوں انقلابی جماعتیں اپنے کارکن صرف متوسط طبقے کے ہندوؤں سے چنا کرتی تھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں، وہ دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانی تحریک آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلۂ کار بنا رکھا ہے اور مسلمان اُس کے اشاروں پر چلتے ہیں...... انقلابی محسوس کرتے تھے کہ مسلمان اصول آزادی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہیں۔"

"جب شیام سندر چکرورتی نے دوسرے انقلابیوں سے میرا تعارف کرایا اور ان دوستوں نے دیکھا کہ میں خوشی سے ان کے ساتھ شریک ہونے کو تیار ہوں، تو انھیں بہت حیرت ہوئی۔ شروع میں ان کو مجھ پر بھروسہ نہیں تھا اور انھوں نے

مجھے اپنی مخصوص محفلوں سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے ان کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ میں نے بحث کر کے انھیں یقین دلانا چاہا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے کہ مسلمان بحیثیت ایک جماعت کے ان سے دشمنی رکھتے ہیں اور یہ مناسب نہیں ہے کہ بنگال کے چند مسلمان سرکاری ملازموں کے رویہ کا جو انھیں تجربہ ہوا ہے اُسے وہ ایک عام حقیقت سمجھ بیٹھیں۔ مصر، ایران اور ترکی میں مسلمان جمہوریت اور آزادی کے حاصل کرنے کے لئے انقلابی کارروائیوں میں سرگرمی دکھا رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہو جائیں گے اگر ہم ان میں کام کریں اور انھیں اپنا دوست اور ساتھی بنائیں۔ میں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر مسلمان مخالفت میں سرگرم یا سیاسی تحریک سے بے تعلق بھی رہے تو آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت زیادہ دشوار ہو جائے گی۔ اس لئے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے کہ اس جماعت کی تائید اور دوستی حاصل کریں۔

"پہلے تو میں اپنے انقلابی دوستوں کو یقین نہ دلا سکا کہ میری سیاسی تشخیص صحیح ہے، مگر وقت کے ساتھ ان میں سے بعض میرے ہم خیال ہو گئے۔ اسی درمیان میں میں نے مسلمانوں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اور میں نے دیکھا کہ نوجوانوں کی ایک جماعت ہے جو نئے سیاسی منصوبوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کو تیار ہے۔"[ا]

یہ واقعہ مولانا کے پہلی بار ہندستان سے باہر جانے سے پہلے کا ہے؛ اس سے ایک طرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا آزاد علی گڑھ پارٹی کی انگریز دوست پالیسی کے اُس وقت بھی شدید مخالف تھے اور قومی تقاضوں کا بھرپور شعور رکھتے تھے دوسری طرف یہ بات بھی ان پر روشن تھی کہ مسلمانوں کے اشتراک و تعاون کے بغیر حصول آزادی

ا۔ ہماری آزادی، صفحات ۱۶-۱۷

کا کام بہت دشوار ہوگا۔ اس امر سے ہم بخوبی واقف ہیں کہ آزادی حاصل کرنا اگر دشوار کام ہوتا ہے تو حصول آزادی کے بعد بقائے آزادی کا کام دشوار تر ہوتا ہے۔ اور آزادی جس مقصد سے حاصل کی جائے اگر وہ مقصد ہی منتشر ہوتا نظر آئے تو نہ صرف یہ کہ آزادی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے بلکہ وہ آزادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ آج ہم جن حالات سے گذر رہے ہیں ان میں ایک حالت وہی ہے جسے ہم ہندو مسلم مسئلہ کہتے ہیں! اس مسئلہ کی جو نوعیت تقسیم سے پہلے تھی اس سے کہیں زیادہ خطرناک صورت اس نے آج اختیار کر رکھی ہے۔ ہندوؤں کی احیائی تحریکوں نے شاید طے کر رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گی، انھیں معاشی اور سماجی اعتبار سے پست اور ذلیل رکھیں گی۔ بس چلا تو اس ملک میں ان کا نشان نہ چھوڑیں گی۔ مولانا آزاد نے ہندو انقلابیوں کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت کو اپنا مخالف نہ سمجھیں، انھیں اپنا ساتھی اور دوست بنائیں۔ ان کی تائید اور دوستی کے بغیر آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت زیادہ دشوار ہو جائے گی آج مولانا آزاد کے نام پر ہندوؤں کی احیائی تحریکوں سے اپیل کی جاسکتی ہے کہ آزادی کو قائم رکھنے اور اسے با مقصد اور با معنی بنانے کے لئے وہ مسلمانوں کے دلوں کو اپنے ہاتھوں میں لیں، ان پر اعتماد کریں، انھیں اپنا ساتھی اور دوست سمجھیں، کروڑوں انسانوں کی اس جماعت کو ذلیل اور پست رکھ کر ملک و قوم کا نام اونچا نہیں کیا جاسکتا۔ ملک اور قوم کی آبرو اور آزادی باقی نہیں رکھی جاسکتی۔

میں خیالات کی رو میں دور نکل آیا۔ مسئلہ تھا اسلام اور قومیت کا۔

۱۹۰۸ء میں مولانا نے ممالک اسلامیہ کا دورہ کیا تھا۔ ان ملکوں میں ان کی ملاقات وہاں کے انقلابیوں سے ہوئی۔ ان کی سیاسی اور تہذیبی تحریکوں سے

ایک حد تک وہ براہ راست واقف ہوئے۔ وہاں کے اُس وقت کے کئی انقلابی رہنماؤں سے تبادلۂ خیال بھی ہوا۔ اپنے اس سفر سے جب وہ واپس آئے تو یہ یقین اور راسخ سیاسی عقیدہ لے کر کہ ملک کی آزادی کی جہم میں مسلمانوں کو اپنے ہم وطنوں کا ساتھی اور دوست ہی نہیں بننا ہے بلکہ جنگ آزادی میں ہراولوں اور رہبروں کا کام کرنا ہے۔ آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے الہلال نکالا جس سے ہم اور آپ بخوبی واقف ہیں۔ الہلال کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو غفلت سے بیدار کرنا اور انگریزی سامراج کے خلاف انھیں تیار کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کی فضا میں یہ کام اسلام، مذہبی اصلاح اور دینی دعوت ہی کے نام پر ہو سکتا تھا۔ اُس وقت مولانا کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اس لئے اُن کے یہاں ہمیں اُس دور میں ایک رومانوی انداز فکر ملتا ہے۔ پھر بھی ان کی یہ کے سب پر بھاری بھی کہ مذہب اسلام غلامی کو ایک لمحہ کے لئے نہیں برداشت کر سکتا، مسلمانوں کا نہ صرف یہ وطنی فریضہ ہے بلکہ دینی فریضہ بھی ہے، کہ وہ غلامی کی بیڑیاں کاٹ کر آزاد ہو جائیں۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات تک کم و بیش یہی صورت رہی۔ پھر جب تحریک تھمی اور لوگوں کی توجہ عملی سرگرمیوں سے ہٹی تو اطراف و جوانب سے اسلام اور قومیت کے مسئلہ پر بھانت بھانت کی آوازیں آنے لگیں، اس وقت مولانا نے لکھا:

"۔۔۔ جب عملی مشغولیت کا دور ختم ہو گیا تو ردِ فعل کا عمل در آمد شروع ہو گیا وہی چیز جو چند دن پہلے ملک کا سب سے زیادہ مقبول عمل تھی، اب ایک مشتبہ اور بحث طلب چیز بن گئی اور فکر و خیال نے طرح طرح کی کاوشیں شروع کر دیں۔ جس وقت ہزاروں کی تعداد میں لوگ قید خانے جا رہے تھے تا کہ ترکی کے ساتھ انصاف کیا جائے اُس وقت کسی کو بھی یہ بات نہ سوجھی کہ اس مطالبہ کا اس درجہ انہاک ہندستانی قومیت کے ساتھ میل کھاتا ہے یا نہیں؟ لیکن اب ہر شخص اسی خیال سے

متفکر ہے اور کوئی زبان اور قلم نہیں جس پر یہ سوال طاری نہ ہو!

"ایک طرف تو یہ لوگ ہیں جو نکتہ چینی کے رنگ میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں، دوسری طرف مسلمان اہل قلم ہیں اور چونکہ خود ان کے سامنے بھی کوئی صاف اور واضح حقیقت نہیں ہے اس لئے عجیب طرح کے افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، کچھ لوگ ہیں جنھوں نے الہلال کے پچھلے صفحات پر اس قسم کی بحثیں دیکھیں تھیں کہ اسلام کی وسعت نظر، وطنیت کی تنگ نظری کی متحمل نہیں، چونکہ بات کا محل اور موقع پر ان کی نظر نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام "نیشنلزم" کا مخالف ہے اور کسی مسلمان کو نیشنلسٹ نہیں ہونا چاہیے۔

"حالانکہ نہ تو اسلام کی وسعت نظر کے یہ معنی ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ نہ قومیت کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسلامی ذہنیت کا دائرہ تنگ کیا جائے۔ یہ دونوں افراط و تفریط میں داخل ہیں اور ہر معاملہ کی طرح یہاں بھی حقیقت اطراف میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈنی چاہیے"[1]

پھر ۱۹۴۰ء میں انھوں نے اس مسئلہ پر اپنا سوچا سمجھا موقف بڑے گونجتے ہوئے لب و لہجہ میں واضح کیا:

> "میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں ــــ کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے

---

[1] مضامین ابوالکلام آزاد، مرتبہ ثناء اللہ خاں۔ لاہور صفحات ۱۴۲ ــــ ۱۴۳

میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں؟ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے! میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں، میں ہندستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔[۵۱]

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے حالات میں بھی ایک محب وطن مسلمان کا یہی موقف ہونا چاہئے اور اسے بغیر کسی جھجک کے خود اعتمادی کے ساتھ اس کا اعلان کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری مذہبی اقلیتوں خصوصاً عیسائیوں کو بھی اسی موقف کو بر اصرار پیش کرنا چاہئے، اور ہندو اکثریت کو اس حقیقی جذبہ اور اس تاریخی صداقت کو تسلیم کرکے ہندستان کے اتحاد کو مستحکم بنانا چاہئے۔ بقول مولانا کے " ہندستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔" قدرت کا یہ فیصلہ احیائی تحریکیں نہیں بدل سکتیں؛ ہاں ان کی سرگرمیوں سے ملک کے اتحاد اور قومی یک جہتی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی قدرت کا یہ فیصلہ مان لینا چاہئے۔ جس ماضی کا وہ خواب دیکھنا چاہتے ہیں وہ اب واپس نہیں آسکتا؛

---

۵۱ خطبات آزاد' مرتبہ شورش کاشمیری، مکتبہ شعر و ادب، لاہور ۱۹۴۴ء صفحات ۳۸-۳۹

ہندستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مشترک زندگی ان کے لئے مقسوم ہو چکی ہے، جو سانچہ ڈھل چکا ہے اب وہ ٹوٹ نہیں سکتا، بھلائی اسی میں ہے کہ کسی اور جانب دیکھنے کے بجائے وہ یہ دیکھیں کہ اس ملک میں جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی حامی کون سی طاقتیں ہیں، ان طاقتوں کے ساتھ وہ اس میدانِ کارزار میں ہمت کے ساتھ کود پڑیں جہاں جمہوریت اور سیکولرزم کے لئے جنگ لڑی جارہی ہے، اس سے متحدہ قومیت کے تصور کو تقویت ملے گی، اور ملک کی بھلائی کے ساتھ خود ان کی بھلائی ہوگی۔ علٰحدگی پسندی کا رجحان انھیں چھوڑنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے الہلال کی للکار سے وہ آزادی کی جنگ میں کود پڑے تھے، آج اُنھیں ملک اور قوم کی نیک نامی کے لئے اُن تمام قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے جو ملک کو تباہی و بربادی کی طرف لے جارہی ہیں۔

ہزار برس سے زیادہ کا عرصہ گذرا کہ مسلمانوں کے تعلقات ہندستان سے بڑھے، اور پھر رفتہ رفتہ اُن کے قدم جم گئے اور وہ یہاں کی آبادی کا ایک حصہ بن گئے، لیکن ہندؤں مسلمانوں کے ہزار سالہ تعلقات میں بھی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ ہندؤں نے اسلام کو اور مسلمانوں نے ہندو دھرم کو سمجھنے کی کوشش کی ہو مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے، لیکن میرا احساس یہی ہے۔ ہندؤں مسلمانوں میں معاشرتی لین دین بھی ہوا، مشترک زندگی کے سانچے بنتے، بگڑتے، سجتے اور سنورتے رہے لیکن خالص ذہنی سطح پر دونوں فرقوں کے درمیان افہام و تفہیم کا کوئی شعوری سلسلہ نہ قائم کیا جا سکا یہی وجہ ہے کہ جب اہم فیصلوں کا وقت آیا تو دونوں فرقوں کی اکثریت کی راہیں مختلف پائی گئیں۔ اب آزادی کے بعد جو ہندؤں اور مسلمانوں کی جو نئی نسل سامنے آئی ہے وہ گوناگوں تاریخی اور سیاسی اسباب کی بنا پر پچھلوں سے زیادہ، ذہنی سطح پر ایک دوسرے سے ناآشنا، ناواقف اور الگ تھلگ ہے

یہ صورت حال آزادی سے پہلے بھی متحدہ قومیت کے لئے ایک چیلنج تھی اور آج بھی ہے، پہلے سے زیادہ شدید اور مضرت رساں شکل میں۔ مولانا آزاد کے یہاں ہمیں اس سلسلہ میں بھی روشنی ملتی ہے (غالباً ۱۹۴۲ء) کی ان کی ایک تحریر سے جسے مرحوم عبدالرزاق ملیح آبادی نے ذکر آزاد (صفحات ۲۷۴-۲۷۵) میں نقل کیا ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"ہندو مسلم اتحاد یقیناً آج اُس سے کہیں زیادہ موجود ہے جتنا کہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں میں امید کرتا تھا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اب تک اُس درجہ تک نہیں پہنچا ہے کہ ہم اس پر پوری طرح اعتماد کر سکیں! میں ڈرتا ہوں کہ بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیال میں اب تک یہ ایک پالیسی سے زیادہ نہیں ہے، محض وقت کے مشترک حالات نے دونوں کو اکٹھا کر دیا ہے......
البتہ میرا یقین ہے کہ کوئی حقیقی رکاوٹ اس کام میں حائل نہیں.... بشرطیکہ باہم اگر غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیا جائے..... مجھے نہایت رنج ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہندستانی انگلستان اور امریکہ کی تاریخ اور لٹریچر حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس مذہب اور اس جماعت کو جاننے کی بالکل پروا نہیں کرتا جو صدیوں سے اُس کے ہمسائے میں موجود ہے۔"

بدقسمتی سے غلامی کے دور میں بیرونی اقتدار نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جان بوجھ کر غلط فہمی پیدا کی اور اس کے لئے تاریخ کو مسخ کر ڈالا۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی ایسے ظلمت پسند افراد کی کمی نہیں رہی جنھوں نے زبان اور کلچر کے نام پر ایسی کتابیں اور مضامین لکھے جن سے رومانوی اور احیائی طرز فکر کو تقویت ملی، اور اس کے لئے انھوں نے محب وطن ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود

خود اپنی تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ خلیج بڑھتی گئی اور آج بھی زبان اور کلچر کے نام پر ہنگامہ برپا ہے اور درس گاہوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ عام طور پر جانب داری کے ساتھ لکھی جاتی ہے۔ اسکولوں میں نصاب کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اُن میں غلط تاریخی واقعات کچھ اس انداز سے ترتیب دئے اور بیان کئے جاتے ہیں کہ طالب علموں کے خام ذہنوں میں مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور یہ تاثر مرتب ہوتا ہے کہ ہندستان میں تہذیبی رنگا رنگی کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ مولانا آزاد کی نظر کے سامنے یہ تمام چیزیں تھیں۔ اور وقتاً فوقتاً اس صورت حال کی مضرت رسانی کی طرف وہ متوجہ بھی کرتے تھے ۱۹۳۹ء میں "نیشنل تحریک" کے عنوان سے انھوں نے ایک رسالہ لکھا تھا، یہ رسالہ چھپ نہیں سکا، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنی تازہ تصنیف "مولانا ابوالکلام آزاد" میں اس کے کچھ ٹکڑے نقل کیے ہیں، میں اس سے ذیل کا اقتباس دیتا ہوں۔ لیکن اس سے قبل یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندستان کی تاریخ کے متعلق مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ وہ از سر نو لکھی جائے اور پوری غیر جانب داری سے لکھی جائے، انڈین ہسٹریکل ریکارڈز کمیشن کے جلسوں میں وہ مورخوں کو ان کا فرض یاد دلاتے رہتے تھے اور غالباً ۱۹۵۱ء میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "انگریزوں کے عہد میں لکھی ہوئی تاریخ قابل اعتبار نہیں سمجھی جا سکتی، کیونکہ تاریخ داں خواہ غیر ملکی طبقے کے حامی ہوں یا محبان وطن، دونوں جانب دار رہے ہیں لہٰذا آزاد ہندستان کے مورخ کا فرض ہے کہ اپنے فرائض سے کماحقہ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے نیشنل تحریک کے قلمی مسودہ میں مولانا نے کلچر اور تہذیب کے مسئلہ پر لکھا کہ

"اگر سمپورنانند جی نے یوپی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ تعلیم کے مسئلہ میں ہندو مسلم کا امتیاز نہیں دیکھنا چاہتے اور نہ کلچر اور تہذیب کے

معاملہ میں ہندو مسلم امتیاز دیکھنا پسند کرتے ہیں تو یقیناً انھوں نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا، نہ ہی کانگریس کا یہ مقصد ہے اور نہ مسلمان اس مقصد سے قیامت تک متفق ہو سکتے ہیں کہ ہندستان سے مسلم تعلیم، مسلم کلچر، مسلم تہذیب، اور مسلم خصائص کے امتیازی اوصاف فنا ہو جائیں .....

"کانگریس نے اقلیتوں کے تحفظ کی جو دفعہ ۱۹۳۱ء کے اجلاس کراچی میں پاس کی ہے اس میں مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو باقی رکھنے کا یقین دلایا گیا ہے .....

"کراچی کی اس تجویز کی توثیق مزید کے لئے گذشتہ سال آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ میں جو تجویز پاس ہوئی تھی، وہ میں نے ہی لکھی تھی؛ بعد میں جواہر لال نے اس میں کچھ ترمیم کی، اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا گیا ہے کہ ہم نہ صرف اقلیتوں کے رسم خط، زبان، اور کلچر وغیرہ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ان کو ترقی بھی دیں گے۔ اس تجویز کا مقصد صاف طور سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی امتیازی ملی حیثیت کو ہندستان کی قومیت متحدہ میں جذب کر دینا کانگریس کا مدعا ہرگز نہیں ہے ....

"مسلمانوں کو صاف طور سے چلا کر اور پکار کر یہ اعلان کر دینا چاہئے، اور اس اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہئے کہ وہ ہندوویت میں جذب ہونے کے لئے ایک لمحے کے واسطے بھی تیار نہیں بحیثیت مسلمان کے ان کی جو قومی خصوصیات ہیں اُس کو نہ صرف وہ باقی رکھیں گے بلکہ ان کو ترقی بھی دیں گے ...."

کہا جاسکتا ہے کہ یہ باتیں تو سنہ ۱۹۳۹ء کی ہیں اب صورت حال بدل چکی ہے ملک کی تقسیم ہوگئی اور مسلمانوں کو ان کا حق مل چکا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خود کانگریس میں کافی لوگ ایسے ہیں جو اسی نہج پر سوچتے ہیں۔ یہ بات جمہوریت، سیکولرزم، اور انصاف و شرافت کے ہر تقاضے کی نفی ہے؛ خود ہمارا دستور اس نظریہ کی نفی کرتا ہے۔ پاکستان میں ہندو اور ہندستان میں مسلم اقلیت کی حیثیت یرغمال کی نہیں، ان کے جو جمہوری حقوق ہیں وہ انھیں ملنے چاہئیں؛ یرغمال کا نظریہ مسلم لیگ کی خود غرض اور تنگ نظر قیادت کا نظریہ تھا، ہم اسے کیسے مان لیں، یہ تو ظالمانہ اور وحشیانہ نظریہ ہے۔ دو تین سال پہلے کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا کے علاقہ میں جب خوف ناک فسادات ہوئے تو ملک کے ذمہ دار لوگوں نے اسے پاکستان کے فسادات کا رد عمل قرار دیا؛ اس کے پیچھے وہی یرغمال کا وحشیانہ نظریہ تھا۔ مولانا نے "ہماری آزادی" (India Wins Freedom) میں اس نظریہ اور اس کے خوف ناک نتائج کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تقسیم ملک کے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں دونوں طرف اس نظریہ کو برملا پیش کیا جاتا تھا میرا خیال ہے کہ ہم بھارت واسیوں کا عمل خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، ہندستان کا ضمیر اس ظالمانہ نظریے کا بوجھ نہیں برداشت کرسکتا اور آج نہیں تو کل اُن ذہنوں سے یہ نظریہ مٹ جائے گا جو مسلم اقلیت کو یرغمال سمجھ کر مسلمانوں کو ہندستان کی متحدہ قومیت کا جزو نہیں سمجھتے۔

زبان اور کلچر کے جھگڑوں کے ساتھ ملک میں ایک اور عفریت ہے جو ہماری یک جہتی اور ہمارے اتحاد کو للکار رہا ہے۔ وہ علاقائی وفاداری یا علاقائیت کا عفریت ہے۔ علاقائی وفاداری کا جذبہ جب اتنا قوی ہو جائے کہ قومی مفادات علانیہ نظر انداز کیے جائیں، سینائیں منظم کی جائیں اور وطن سے وفاداری کے جذبہ کے اظہار

کے لئے کسی بیرونی حملے کا انتظار رہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری ہیئت اجتماعی کو انتشار کا وہ گھن لگ چکا ہے جو اندر ہی اندر اسے اتنا کھوکھلا اور کمزور کر دے گا کہ باد مخالف کا ایک معمولی جھونکا بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ مولانا کی بصیرت کی داد دیجئے کہ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا تھا، اپنے سیاسی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے وہ عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھتے ہیں:

"ایک اور نہایت اہم بات ہے جس کی طرف مجھے اشارہ کر دینا چاہئے اگر ہم ہندستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ مختلف صوبوں اور حصوں کی یگانگت کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روز بروز ایک نئی تفریق "پراونشیلزم" کی جگہ لیتی جا رہی ہے۔ "مائی انڈیا" کی جگہ "مائی بنگال" کی صدائیں میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں ... آپ یقین کیجئے آگے چل کر یہ چیز انڈین نیشنلٹی کے لئے سخت مضر ہوگی۔"[۵]

مسلمانوں کی مذہبی اصلاح سے متعلق مولانا کے افکار و خیالات کی وضاحت کے سلسلہ میں سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ کیا محرکات تھے جن کے سبب انھوں نے شاہراہ عام سے کٹ کر ایک الگ راہ اختیار کی۔ میرے خیال میں سب سے پہلے ان کی صالح طبیعت اور نورانی فراست نے موروثی عقائد کی طرف سے اُن کے دل میں چبھن پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شک اور اضطراب نے ان کی روح کو بے چین کیا اور وہ حقیقت کی تلاش و جستجو میں نکل کھڑے ہوئے "تذکرہ" کے آخری صفحات پر شعر و خطابت کے پردے میں اور "غبار خاطر" میں صاف صاف

---

۵ ذکر آزاد صفحات ۲۷۷ — ۲۷۸

انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ صالح طبیعت کے اضطراب کو قدرے سرسید کی عقلیت اور آزاد خیالی سے سکون ملا لیکن جیسا کہ آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی "کے مرتب نے لکھا ہے، سرسید کی تقلید کا خمار بھی جلد ہی اتر گیا:

"شکوک اور کاوش نے مزید وسعت اختیار کی اور سرسید کی انتہائی بلند پروازیاں بھی وہاں ساتھ دینے سے درماندہ ہو گئیں۔"

اس کے بعد حیرانی و سرگشتگی، شک اور انکار کی جو منزلیں ان کو طے کرنا پڑی ہوں گی ان کا احساس و ادراک ہم "سرگشتگان خمار رسوم وقیود" نہیں کر سکتے۔ بالآخر مولانا کو "اوہام و خیالات کی گہری تاریکیوں کے اندر وہ روشن اور قطعی راہ مل گئی جو یقین اور اعتقاد کی منزل مقصود تک چلی جاتی ہے" فکر و نظر کے ایسے ہفت خواں طے کرنے کے بعد جس شخص کو مذہب کی اُس حقیقت کا سراغ مل جاتا ہے جسے حقیقی مذہب یا سچی مذہبیت کہتے ہیں، وہ تقلید کی ہر زنجیر کو توڑ ڈالتا ہے، جمود کو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتا اور زندگی کو ارتقا یعنی مسلسل، بتدریج اور فطری ترقی سے تعبیر کرتا ہے۔

قرائن سے صاف پتہ چلتا ہے اور کہیں کہیں ذکر بھی ملتا ہے کہ مولانا پر عالم عرب کی سلفی تحریک کا بھی اثر پڑا تھا، خاص طور سے اُس عہد میں جب مصر میں رشید رضا کے "المنار" گروپ نے دنیائے اسلام کے علمی ماحول میں ایک حرکت پیدا کر رکھی تھی۔ "تذکرہ" میں ابن تیمیہ سے مولانا کی جس گہری عقیدت کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی اس کی غماز ہے کہ سلفیوں کے اثر سے مولانا عہد وسطیٰ کے ثقیل، فقہی موشگافیوں سے بوجھل، جامد اسلام کی تقلیدی ذہنیت سے متنفر اور قرن اول کے اسلام کی فطری سادگی اور حرکی خصوصیت کے شیدائی تھے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ طبقہ علماء پر جس کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا کام

ہے یہ حقیقت روشن ہوجائے کہ جسے وہ اسلام سمجھ رہے ہیں وہ حقیقی اسلام نہیں ہے،
درس نظامیہ جس کی درسی کتابوں کو خود انھوں نے پڑھا تھا موجودہ دور میں مسلمانوں
کی ذہنی ترقی کا سامان نہیں فراہم کرسکتا، علمار کی اخلاقی حالت سے بھی وہ مطمئن نہیں
تھے، ندوۃ العلمار کے حلقہ کے علمار کو وہ روشن خیال سمجھتے تھے لیکن انھیں قریب
سے دیکھنے کا موقع ملا تو انھیں بہت مایوسی ہوئی۔ مولانا اپنی زندگی کے آخری لمحات
تک اس کے آرزو مند رہے کہ عربی مدارس کے نصاب میں ضروری اور تقاضائے
وقت کے مطابق تبدیلیاں کرلی جائیں، علمار الگ الگ ان کی باتیں مان لیتے تھے اس
لئے کہ درس نظامیہ کی خرابیوں اور کوتاہیوں پر ان کی جو دلیلیں ہوتی تھیں ان کا
کوئی توڑ علمار کے پاس نہیں تھا لیکن جب باہم مل بیٹھ کر مجوزہ تبدیلیوں کے نتائج
پر غور کرتے تھے تو انھیں اپنے، اپنے خاندان اور اپنے طبقہ کے خود غرضانہ مفادات
کی تباہی نظر آتی تھی اس لئے صاف، دیدہ و دانستہ غفلت کی چادر تان لیتے
تھے۔ چند جو نیک نیت تھے تقلید اور اسلاف پرستی کی بیڑیاں نہیں کاٹ سکتے
تھے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ طبقہ علمار کے اس رویہ سے مسلمانوں کو کتنا عظیم نقصان پہنچ
چکا ہے اور آئندہ بھی پہنچے گا، مولانا کے دل پر یہ داغ بہت گہرا تھا اور اسے وہ اپنے
ساتھ اس دنیا سے لے گئے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ کوئی قوم تاریخ اور ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرسکتی
لیکن ماضی کا غلط احترام حرکت اور تغیر کی نفی کرتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ
عہد وسطیٰ کا اسلامی نظام قرآن کی اندرونی روح کے منافی تھا۔ اسی لئے عہد جدید
کے چیلنجوں کا وہ مقابلہ نہیں کرسکا اور یہی وجہ ہے کہ ساری دنیائے اسلام رفتہ رفتہ
ان چیلنجوں کے سامنے سرنگوں ہوگئی۔ اس تاریخی حقیقت کو مولانا کے قاموسی کار دو
عبقری ذہن نے سمجھ لیا تھا، اسی لئے انھوں نے قرآنی تعلیمات کی اندرونی روح

کے سمجھنے میں عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا اور پھر تعلیمات کو اپنے مخصوص اسلوب بیان کے سہارے ہزاروں انسانوں کے دلوں میں اتار دیا۔ طبقۂ علماء مولانا کے ترجمے اور تفسیر کو مستند نہیں سمجھتا۔ اور باتوں کے علاوہ سب سے بڑی شکایت اُسے یہ ہے کہ وہ وحدت ادیان کا نظریہ پیش کرتے ہیں، مولانا کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے اپنی فہم کے مطابق انھوں نے قرآن کی سادہ، فطری اور دل میں اتر جانے والی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ حقیقت ایک ہے، سچائی ایک ہے، مختلف مذاہب اپنے اپنے طریقے سے اُس سچائی کی طرف لے جاتے ہیں، اس لئے جھگڑا درحقیقت مختلف مذاہب میں نہیں ہے بلکہ مدعیان مذاہب میں ہے۔ مذہب کی حقیقی روح کو اگر لوگ سمجھ لیں تو سب خدا کے پرستار اور اعمال صالحہ کے طالب گار ہو جائیں اور عمل صالح وہ قدر ہے جو کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے تمام مذاہب میں تقریباً یکساں ہے، پھر مذہب کے نام پر یہ نزاعات کیوں؟

فوٹو اور اسٹیج کا مسئلہ ہو یا اُس فتنے کا جسے مولانا فتنۂ قبور کہتے ہیں، غرض زندگی کا کوئی معاملہ ہو وہ فقہی اور قانونی نقطۂ نظر سے مصالح اور دفع مفاسد کا کلیہ سامنے رکھتے ہیں اور اس بنیاد پر ان کے خیال میں مسلم سوسائٹی زمانے کے ہر تقاضے کا جواب دے سکتی ہے بشرطیکہ ذہن کے دریچے بند نہ ہوں، آنکھیں کھلی ہوں اور کان وقت کی پکار سن رہے ہوں۔

مولانا کا خیال تھا کہ مسلمان اگر اس حقیقت کو سمجھ لیں تو وہ اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں اور جس ملک میں رہتے ہیں اُس کی تعمیر و ترقی میں بھی ممتاز حصہ لے سکتے ہیں، کیونکہ اس سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی، خوف، شک اور تذبذب سے جس کی کاٹ دودھاری تلوار سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، وہ بچے رہیں گے اور تاریخ میں وہ نمایاں اور عہد آفریں کام کر جائیں گے جسے ان کے اسلاف نے کبھی کیا تھا،

سردار محمد اکبر خاں مرحوم کو مولانا لکھتے ہیں " دنیا میں جماعتی حقوق و مفاد کا تحفظ خود اعتمادی کی روح سے ہوتا ہے نہ کہ ہمت فروشی کی اندیشہ ناکی سے ۔ " انھیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں ،

" دراصل اس بارے میں اول دن سے میرا اور ابنائے عصر کا اختلاف فرع میں نہیں اصل میں ہے ۔ سوال یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو اپنے سیاسی مستقبل کا جو مقدمہ بنانا چاہیے اُس کی بنیاد عزم اور یقین پر ہونی چاہیے یا خوف و تشکیک پر ، میں کہتا ہوں عزم و یقین پر ، لوگ کہتے ہیں نہیں خوف اور شکوک پر ، سارا اختلاف اسی اصل کا ہے ۔ تم میں جو چیز کام کر رہی ہے وہ محض سیاسی ہی نہیں ہے کچھ اور بھی ہے ۔ میں نے اول دن سے افکار و عقائد کے جو اصول سامنے رکھے ہیں وہ قرآن کی تعلیمی روح پر مبنی ہیں میں محض دلائل سے نہیں بلکہ ایمان و یقین سے اپنی عمارتیں استوار کرتا ہوں میں ایک لمحہ کے لئے یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ مسلمان کسی راہ میں بھی خوف اور شک کی تاریکی ساتھ لے کر چل سکتے ہیں ، ان کے لئے ہر گوشہ میں ایمان و یقین کی روشنی موجود ہے ، لیکن بعض ابناء عصر ان بنیادی عقائد سے آشنا نہیں اور اس لئے بہت دشوار ہے کہ وہ کسی راہ میں بھی مجھ سے متفق ہو سکیں [۱] "

ابنائے عصر کے ہاتھوں اس برّ صغیر میں اسلام اور مسلمانوں پر جو کچھ گذری وہ ہمارے سامنے ہے ۔ اس برّ صغیر کی وقیع اور با وقار اقلیت تین حصوں میں بٹ گئی ۔ کہتے ہیں کہ دو حصوں میں اسلام خطرہ میں ہے اور ایک حصہ میں مسلمان ، لیکن

---

[۱] نوادر ابوالکلام صفحات ۲۵ — ۲۶

اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے، ملک کے روشن خیال اور ترقی پسند عناصر کے ساتھ مل کر مسلمان ہندستان میں تاریخی رول ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ ان میں عزم و یقین ہو، اور یہ عزم و یقین اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ مسلمان عہد وسطیٰ کے جامد، غیر متحرک اور بے جان اسلام کی سرحدوں کو عبور کر کے قرن اول کے اسلام کی طرف لوٹ جائیں، جس کی بے میل فطری سادگی، عزم و یقین اور عمل صالح کے لئے مہمیز کا کام کرتی تھی، جو علم کا مخالف نہیں تھا، جو ترقی کا دشمن نہیں تھا بلکہ جس سے زندگی اور اس کے اعلیٰ مقاصد کو بڑھاوا ملتا تھا۔

مولانا نہ تو دور غلامی میں مسلمانوں کا حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر رہ جانا پسند کرتے تھے اور نہ ہندستان میں انھیں کاسہ لیسی کی زندگی گذارتے دیکھنا چاہتے تھے، کوئی موت جماعتی زندگی کے لئے اس سے زیادہ کرب ناک موت نہیں ہو سکتی۔ وہ مسلمانوں کو سرتاپا عمل دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جس طرح ماضی میں مسلمانوں نے تاریخ ہند میں کئی روشن بابوں کا اضافہ کیا ہے اُسی طرح مستقبل کی تاریخ میں بھی ان کے لئے نمایاں جگہ ہو۔ آج سے بہت پیشتر مولانا نے 'الہلال' کے صفحات میں جو کچھ لکھا تھا اُس کے الفاظ و معانی میں تھوڑی رد و بدل کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی ہندستان کے مسلمانوں کے لئے اُن کا وہی پیغام ہے۔

> "جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا ... اور وہ سب کچھ ہو چکے گا جس کا ہونا ضرور ہے، فرض کر لیجئے کہ اس وقت ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا، اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لئے ایک روک، ملک کی فلاح کے لئے ایک بدقسمتی، احاکمانہ طمع کا کھلونا

اور ہندستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم بن کر رہی۔"

بات ذرا کڑوی ہے لیکن سچی ہے۔ میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اس سرزمین کی مظلوم آتما اُن کی طرف دیکھ رہی ہے، مشیتِ الٰہی کی آنکھیں انھیں کی طرف لگی ہیں کہ وہ خود اعتمادی، عزم اور یقین کے ساتھ اٹھیں، اپنی ظلمت پسندی اپنے خول میں سکڑ بیٹھنے کے رجحان اور اپنے ماضی پر نازاں اور مطمئن رہنے کی عادت چھوڑ کر اٹھیں اور اُس میدانِ کارزار میں کود پڑیں جہاں زندگی موت سے دست و گریباں ہے جہاں حق و باطل میں نبرد آزمائی ہو رہی ہے جہاں جمہوری اور انسانی قدریں اپنے بے شمار دشمنوں کے نرغے میں ہیں۔ اسی طرح اور صرف اسی طرح وہ مشیت الٰہی کی تکمیل میں حصہ لے سکتے ہیں، اور صرف یہی وہ طریقہ ہے جسے اپنا کر وہ مادرِ وطن کے ماتھے کا ٹیکہ بن سکتے ہیں۔

ابوسالم[1]

مجھے ضیا صاحب کے مقالے کے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ جو بنیادی تقریر ہے وہ پروفیسر آلِ احمد سرور کی ہوگی[2] اور ان سے مجھے کافی اختلاف کا اندیشہ تھا۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ میں ضرور بولوں گا۔

میرا خیال ہے کہ اس سیمینار میں اگر ہم اس موضوع پر سوچیں اور غور کرنے کی کوشش

---

[1] پروفیسر ابوسالم کا موضوع اقتصادیات ہے۔ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈر تھے۔ اب نئی دہلی کے انسٹیٹیوٹ آف اپلائڈ اکنامکس سے وابستہ ہیں۔

[2] سیمنار کے لئے بنیادی مقالہ پروفیسر آلِ احمد سرور ہی لکھنے والے تھے

کریں کہ ضیا، صاحب نے جو بنیادی مسایل سامنے رکھے ہیں انھیں عملی جامہ پہنانے کے لئے
کیا صورت اختیار کی جاسکتی ہے، تب ہی ہم کوئی مفید کام کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ
کہنا شاید میرے لئے مناسب نہ ہوگا۔

نورالدین احمد: اپنے فن کی روشنی میں اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالئے۔

عتیق صدیقی: آپ تو ماہر اقتصادیات ہیں۔ مسلمانوں کے معاشی مسایل کے بارے میں
کچھ کہئے۔

ابو سالم: ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاشی مسایل کا حل کیا ہو۔ اس سلسلے
میں جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے، اس میں ہم لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ عام طور
پر یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف Discrimination (امتیاز)
برتا جاتا ہے، اس لئے وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ کچھ دن پہلے جب بدرالدین طیب جی علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی کے وایس چانسلر بنائے گئے، تو انھوں نے یونیورسٹی میں اس قسم کا ایک سروے
کرانے کی کوشش کی تھی، جس کے نتیجے میں امید تھی کہ یہ ثابت ہو سکے گا کہ محض ڈسکری مینیشن
کی وجہ سے مسلمانوں کو نوکریاں ملنے کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی بد قسمتی سے اس سروے کے
نتیجے نے یہ نہیں دکھایا، بلکہ نتیجے نے یہ ثابت کیا کہ جہاں تک آرٹس کے طالب علموں کا تعلق ہے
امپلائے منٹ [ملازمت Employment] ملنے میں دشواری ہوتی ہے۔
اور یہ دشواری ہر جگہ مشترک ہے۔ آرٹس کے طالب علموں کو شاید آج ہندستان کے کسی گوشے
میں بھی آسانی سے ملازمتیں نہیں ملتی ہیں۔ جہاں تک سائنس اور ٹکنالوجی کے طالب علموں کا تعلق
ہے یہ نتیجہ نکلا تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے مسلمان طالب علم بھی اتنی ہی آسانی سے امپلائے منٹ
[ملازمت] حاصل کر لیتے ہیں، جتنی آسانی سے دوسرے طبقوں کے لوگ حاصل کرتے ہیں۔
ایک بات جو سب سے اہم ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ سمجھنا ہے کہ ڈسکری مینیشن کی
رٹ لگائے جانا نہ صرف ان کی بزدلی کی دلیل ہے بلکہ اپنے مستقبل کو خود اپنے ہاتھوں تباہ

کرنے کا یقینی طریقہ ہے۔

عبدالدائم جلالیؔ[1]

ہمارے فاضل مقالہ نگار (ضیاء الحسن فاروقی) نے بہت ہی پرفخر، پرحکمت، مفید باتیں ہمیں سنائیں اور مولانا آزاد مرحوم کی زندگی پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا۔ میں نے جہاں تک مولانا آزاد کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے، اور تقریباً چالیس سال کے عرصے سے میں ان کو پڑھ رہا ہوں میں نے ان کی شخصیت کو مجموعہ اضداد پایا۔ مگر صحت مند مجموعہ اضداد۔ حکیم کوثر (چاندپوری) صاحب یہاں موجود ہیں اور وہ شہادت دیں گے کہ مجموعہ عناصر، عناصر مختلف کا نام ہے۔ اگر وہ اعتدال حقیقی کے قریب ہو تو صحت مند زندگی ہوگی۔ پس مولانا کے اندر بھی میں نے یہی چیزیں پائیں۔ مختلف قوتوں کا ظہور پایا، کبھی وہ نثر شعری اور کبھی شعر نثری لکھ کر ادیب کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ان کے اندر، ان کے کلام کے اندر جذباتیت بھی ہے اور معنویت بھی۔ شعر کی ان دونوں خصوصیتوں کے علاوہ ان کی نثر کے اندر استدلالِ منطقی بھی ہے، تعبیر بھی ہے، وضاحت بھی ہے؛ اور نثر کی خصوصیات بھی ہیں۔ تو میں ان کو نثر شعری کا حامل کہوں یا شعرِ نثری کا، بہرحال، ایک ادب ہے، ایک اپنا اسلوب ہے، اور ایک ایسا اسلوب ہے جو نثریت اور شعریت دونوں کی جان ہے اہلِ ادب کہتے ہیں کہ شعر کی اگر نثر کی جائے تو اس کی جذباتیت فوت ہو جاتی ہے، معنویت ختم ہو جاتی ہے، نثر کی نظم کی جائے، نثر کو شعر بنایا جائے تو ترتیب اور استدلال

---

[1] مولانا سید عبدالدائم جلالی، سابق پرنسپل کالج رام پور، حال مفتی و مدرس مدرسہ فتح پوری، دہلی۔

منطقی اور وضاحت نہیں رہتی۔ لیکن یہ عجیب نثر ہے کہ اس کے اندر خصوصیات نثری بھی ہیں اور خصوصیات شعری بھی۔ یہ تو ایک مجمل بات ہے۔ اب دوسری بات پر آجایئے کہ ہم ان کو ایک لیڈر بھی پاتے ہیں — قومی لیڈر۔ لیڈر کیا معنیٰ، یعنی بے باک جرنیل، جو ایک نقشہ بناتا ہے، پھر اس نقشے پر خود چلتا ہے، اپنے ساتھیوں کو لے کر گھس پڑتا ہے، انجام کا خیال نہیں کرتا، جو کچھ بھی نتیجہ ہو، وہ ہو، جرأت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے — خود بھی آگے بڑھتا ہے، ساتھیوں کو بھی لے کر آگے بڑھتا ہے۔

پھر مولانا کا ایک زندگی کا فلسفہ بھی ہم نے پڑھا، تو فلاسفر بھی پایا، جو نئے نقشے بناتا ہے، پھر ان کو بھی سناتا ہے۔ تو ایک حیثیت فلاسفر کی بھی ہم نے ان کے اندر پائی۔

اور چوتھی چیز ہم نے ان کی یہ پائی کہ وہ مصلح تھے، ریفارمر تھے۔ مجھے اس مجلس میں بیٹھ کر ان کی اس آخری حیثیت سے بحث کرنا ہے مصلح ہونے کی حیثیت سے۔ اور لیڈر شپ ان کی کیا تھی فلسفی وہ کیسے تھے، یہ نہ تو موضوع ہے یہاں پر اور نہ اس کی بحث کی ضرورت ہے۔ مجھے تو اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے فقط مولانا کی اصلاحی زندگی کو پیش کر کے۔

میں دیکھتا ہوں کہ مولانا کے اندر انفرادیت اتنی کامل ہے، لیکن انفرادیت کے ساتھ ساتھ مجھے ان کی آفاقیت کامل بھی نظر آتی ہے۔ ایک طرف انفرادیت ہے ایک طرف ان کی آفاقیت۔ انفرادیت کا مطلب آپ شاید سمجھ گئے ہوں گے کہ جس فرقے میں وہ پیدا ہوئے، جس گروہ میں پلے، جس گروہ میں وہ بڑھے، جس گروہ میں انھوں نے تعلیم پائی اس کی تمام خصوصیات کے حامل ہونا چاہتے ہیں۔ وہ تمام ضمنی تقاضے پورا کرنا چاہتے ہیں، جو مذہب چاہتا ہے — دوسری طرف میں نے ان کی آفاقیت بھی دیکھی جو انسانیت عامہ میں ان کی نظر کے سامنے تھی، جو ہر نیشنلزم سے آزاد ہے۔ جغرافیائی حدود سے آزاد ہے، قبایل سے آزاد ہے، قوموں سے آزاد ہے، یہاں تک کہ ملیت سے بھی آزاد ہے۔ ایک ایسی آفاقیت بھی میں نے ان کے اندر پائی ہے۔

دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں۔

ہمارے فاضل مقالہ نگار نے ایک چیز جس کی طرف اشارہ کیا تھا وحدتِ ادیان کا مسئلہ، میں اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالوں گا۔ انفرادیت کے متعلق تو مقالے میں سب کچھ آچکا ہے کہ مولانا اپنی ثقافت کو، اپنے کلچر کو، تہذیب کو اور کسی مذہبی قانون کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں اور نہ تیار تھے۔ یہ ہمیں معلوم ہو گیا اور ہم نے ان کی کتابیں جو پڑھیں ان سے بھی یہی چیز اخذ کی۔ بات یہ ہے کہ یہ زمین ایک ہے اور انسان بھی ایک ہی ہے۔ قدرت کی طرف سے یہ زمین ایک ہی بنی ہے، اور انسان بھی ایک ہی سے بنے ہیں۔ ایک ہی انسان کی سب یہ نسل ہے اور یہ زمین بھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی انسانوں نے اپنے خواہشات کے مطابق اپنی سمجھوں کے مطابق، عقلوں کے مطابق اس زمین کے ٹکڑے کئے، اور ٹکڑے کئے تو کچھ انسانوں نے ایک ٹکڑے میں سکونت اختیار کی۔ اب بن گئے وطن۔ پہلے تھی ایک زمین۔ اب اس کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حد بندی کرنے کے بعد بنے وطن۔ وطنوں میں اور ٹکڑے کئے تو صوبے بنے اور صوبوں کے ٹکڑے کئے تو ضلعے بنے اور ضلعوں کے ٹکڑے کئے تو گاؤں بنے اور گاؤں کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کا مالک بن گیا۔ یہ ایک آفاقیت تھی جو تقسیم ہوتے ہوتے ایک بالشت زمین تک اور ایک انچ زمین تک پہنچ گئی۔ اسی طرح ایک آفاقیت انسانیہ بھی تھی، وہ تو ایک عام چیز تھی — ایک عام انسانیت۔ لیکن جب وہ نیچے اتری تو اس انسانیت کی بھی تقسیمیں ہو گئیں۔ کبھی یہ وطنی تقسیم کی شکل میں ہمارے سامنے آئی اور کبھی صوبائی تقسیم کے روپ میں، اور کبھی یہ ضلع اور کبھی محلہ اور کبھی یہ گاؤں کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔ یہاں تک کہ یہ کبھی آگئی قبایلی شکل میں، اور قبایلی شکل میں سے بھی غالبیت اور مغلوبیت کا رشتہ قایم ہوا۔ ازدواج کا اور میاں بیوی کا رشتہ قایم ہوا اور یہ فرق مراتب ہوتا چلا گیا۔ مگر اس بات پر خوب غور کر لیجئے کہ اگر آفاقیت کھو دی

تو دنیا تباہ ہوجائے گی۔ اگر دنیا میں یہ قبایلی لڑائیاں ہونے لگیں تو یہ آفاقی انسانیت کدھر جائے گی! اگر تمام جغرافیائی حدود کے رہنے والے آپس میں ٹکرا جائیں تو وہ زمین کی وحدت کہاں جائے گی! یقیناً وہ فنا ہوجائے گی۔ اسی صورت سے ہم اگر اپنی انفرادیت کو کھو دیں، بالکل ختم کردیں، تو پھر بچوں کی پرورش کیسے ہوگی؟ کیا ہمارا رشتہ چین والے یا کوہستانی علاقے کے رہنے والے سے وہی ہے جو ہمارا رشتہ اپنے بیٹے سے ہے، اپنے بھائی سے ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ یہ رشتہ کچھ اور ہے، وہ رشتہ کچھ اور ہے۔ نہ انفرادیت کو تباہ کیا جاسکتا ہے آفاقیت کو سامنے رکھ کر، نہ آفاقیت ہی کو خیرباد کہا جاسکتا ہے انفرادیت کے عقیدے میں پھنس کر ـــــ معلوم یہ ہوا کہ اس انفرادیت اور آفاقیت کا فیصلہ اگر ہوسکتا ہے تو فقط ایک چیز سے ہوسکتا ہے، وہ ہے معاشرہ سے ظلم کو دور کرنا۔ اگر انسانی معاشرہ سے ظلم کو دور کردیا جائے ـــــ معاشرہ سے مراد میرا اور آپ کا ماحول نہیں ہے بلکہ انسانیت عامہ کا معاشرہ۔ عالم کا معاشرہ ہو، انسانی معاشرہ ہو، اگر معاشرہ سے ظلم کو اور حق تلفی کو دور کردیا جائے تو یہ سب سے بڑا پیام ہے مولانا کا، وحدت ادیان کا۔ اسے خوب سمجھ لیجئے کہ وحدت ادیان کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ شریعتوں کو متحد کردیا۔ شریعتیں تو متحد نہیں ہوسکتیں، رفتارِ زندگی تو متحد نہیں ہوسکتی، لیکن مقصد زندگی متعین ہوسکتا ہے۔ پس دین تو وہی ہے لیکن شرایع مختلف ہیں، چلنے کے راستے مختلف ہیں، لیکن ایک ہی مقصد ہے ان سب راستوں پر چلنے کا ـــــ وہ ہے ظلم کو دور کرنے کا۔ اگر ظلم کو دور ہم نہ کرپائے ـــــ خواہ ہندو ہوں یا عیسائی، یہودی ہوں یا مسلم، یا کسی بھی مذہب کے حامل ہوں، یا وہ لوگ جو مذہب سے متنفر ہیں نیا طریقہ زندگی کا پیدا کر رہے ہیں یہاں تک کہ خدائی کا بھی وہ انکار کرتے ہیں، اگر ظلم کو وہ اس دنیا سے دور نہ کرسکا، اگر حق تلفی کو دور نہ کرسکا، تو اس نے اپنے مذہب کو فوت کردیا، اپنی مقصدیت کو فوت کردیا۔

مذہب نام اس کا نہیں ہے کہ میرا نام مسلمان ہے، دوسرے کا یہودی، اور تیسرے کا نام عیسائی یا ہندو ہے۔ مذہب ان مذہبی ناموں کا نام نہیں ہے، یہ تو علامات ہیں مقصد نہیں ہیں۔ اصل مقصد ہے ظلم کو دور کرنا یعنی اگر ظلم دور ہو جائے ۔ اقتصادی مظالم بھی دور ہو جائیں، یعنی معاشی مظالم دور ہو جائیں، عزت کے اور دولت کے مظالم بھی دور ہو جائیں تو پھر یقیناً انسانیت صالحہ پیدا ہو جائے گی۔ مولانا نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ اسے خوب سمجھ لیجئے۔ وہ جانتے تھے کہ باپ کے مجھ پر کیا حقوق ہیں، وہ جانتے تھے کہ میری بیوی کے مجھ پر کیا حقوق ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کلکتے والوں کے کیا حقوق ہیں اور ہندستان والوں کے کیا حقوق ہیں۔ مذہب سے کوئی تعلق نہیں وہ سب کو جانتے تھے۔ اپنے طور پر وہ انسانیت عامہ کے حقوق کو بھی جانا کرتے تھے پس ایک طرف جہاں وہ خالص مسلم تھے، مسلم کلچر کے حامل تھے، دوسری طرف انسانیت عامہ کے واسطے پیام اصلاح بھی لائے تھے۔ پس مجھے اتنا ہی کہنا تھا اور اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں۔ وقت آپ کے پاس تھوڑا ہے۔

عبدالخالق نقوی[1]

فاروقی صاحب کا مقالہ شروع ہو چکا تھا جس وقت میں حاضر ہوا۔ میں نہیں عرض کر سکتا کہ انھوں نے اس کے ابتدائی حصے میں کیا سوال اٹھایا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مولانا کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک فاروقی صاحب کو کامیابی بھی ہوئی ہے۔ لیکن مولانا کی زندگی کے بہت سے گوشے ایسے

---

[1] مولانا سید عبدالخالق نقوی، عربک پروفیسر مدرسہ عالیہ (نئی دہلی)

بھی نظر آتے ہیں جو محتاج تھے اس بات کے فاروقی صاحب ان پر بھی روشنی ڈالیں۔

مثلاً مولانا آزاد نے ایک "حزب اللہ" قایم کی تھی۔ وہ حزب اللہ کیا چیز تھی؟ اس کا کیا مقصد تھا؟ الہلال اور البلاغ میں مستقل ایک مضمون آیا کرتا تھا "من انصاری الی اللہ"، اللہ کے راستے میں میری مدد کرنے والے کون کون ہیں! وہ اپنے نام لکھوائیں ایک فارم ہوتا تھا۔ لوگ وہ فارم بھر کر بھیجتے تھے۔ وہ کس قسم کی جماعت مولانا قایم کرنا چاہتے تھے، اور اس کا کیا حشر ہوا؟ کیوں پھر وہ Idea چھوڑ دیا مولانا نے؟

اس کے علاوہ مولانا کے خیالات میں بھی تغیر اور تبدل ہوتا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مولانا جس چیز کو شروع سے لے کر چلے تھے، وہ آخر تک اس پر قایم بھی رہے۔ مثال کے طور پر میں عرض کروں گا کہ مولانا کا ایک طریقہ خطابت کا یا تقریر کا ایسا تھا کہ اس میں بمباسٹک (Bombastic) قسم کے الفاظ۔ بہت ہی ثقیل بہت موٹے موٹے قسم کے الفاظ فارسی عربی ترکیبیں [ہوتی تھیں]۔ رفتہ رفتہ پھر ان کو اندازہ ہوا کہ اس کا فایدہ زیادہ نہیں ہے۔ آسان زبان میں ہم کو کہنا چاہیے، جو کچھ کہنا ہے۔ پھر آخر میں جب مولانا نے ترجمان القرآن کا پہلا اور دوسرا حصہ شایع کیا تو اس سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنا قدیم طرز، جو ان کا تھا، چھوڑ دیا تھا۔

اسی طرح سے غالباً مذہبی اور دینی مسایل میں بھی ان کے یہاں تبدیلی آتی رہی ایک زمانہ یہ تھا کہ مولانا نے تصویر کھنچوائی۔ لوگوں نے اعتراض کیا۔ اس کے بعد انھوں نے معذرت نامہ شایع کیا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تصویریں کھنچوائیں، تصویریں نہیں کھنچوانا چاہیے تھیں، تصویر بنوانا جائز نہیں ہے۔ لیکن مولانا، پھر اپنے اسی اصل مسلک، جو ان کا قدیم مسلک تھا، پھر اسی پر قایم ہو گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ ان حضرات کو تصویریں کھنچوانے پر جو اعتراض ہے، اس زمانے میں بہت گو مگو، واہیات اور لغو ہے اس زمانے میں اس کی کوئی Value نہیں ہے۔

رہا مولانا کا سیاسی مسلک، تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے فاروقی صاحب نے اس پر بڑی خوب صورتی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اور جو مسایل ہمارے ملک کو اس وقت درپیش ہیں، ان کا انھوں نے کافی احاطہ کیا ہے اور ان پر انھوں نے تبصرہ کیا ہے. بہت اچھے انداز میں۔ اور اس میں جو مولانا کا فکر و نظر اور جو مولانا کے سوچنے کا ڈھنگ تھا، اس کی نمائندگی ہوگئی ہے اور بڑی اچھی طرح ہوگئی ہے۔

ایک بات مجھے یہ عرض کرنا تھی کہ فاروقی صاحب نے اپنے اس مقالے میں ایک جگہ یہ فرمایا ہے کہ "مسلمانوں کو اس دھارے سے کٹ کر نہیں رہنا چاہئے جو قومی زندگی کا عام دھارا ہے" اور یہ جو علاحدگی پسندی کا رجحان ہے اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ صرف فاروقی صاحب ہی نہیں، بلکہ یہ ایسی بات ہوگئی ہے جس کو عام طور پر لوگ اس زمانے میں کہتے ہیں۔ اگر یہ کہوں کہ یہ تکیہ کلام بن گیا ہے، تو غالباً یہ تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کو علاحدگی پسندی کا رجحان چھوڑ دینا چاہئے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس سے کیا مطلب ہے ان کا؟ اس سلسلے میں To the point، بالکل Clear-cut بات کوئی نہیں بتلاتا کہ علاحدگی پسندی کسے کہتے ہیں؟ اس زمانے کے مسلمانوں میں کون سی ایسی چیز ہے؟ زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے؟ کون سا ایسا پہلو ہے جس میں حصہ نہیں لیتے ہیں؟ یعنی جو چیزیں مسلمانوں کے مذہبی اصولوں کے مطابق ہیں وہ، یا وہ جو مسلمانوں کے مذہبی اصول کے خلاف ہیں۔ دیکھیے فلم انڈسٹری تو مسلمان اس میں شامل ہیں۔ اسپورٹس میں بھی مسلمان شامل ہیں۔ اب جو Beauty contest (مقابلہ حسن) شروع ہو گئے ہیں اس میں بھی اس وقت ہندستان میں اس کو پہلا انعام ملا ہے شاید۔ [ایک آواز: اور کتھا کلی۔۔۔]

جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق ہے، جو اونچی ملازمتیں ہیں ان کے بارے میں شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ چوں کہ ان کی تعلیم اور ان کی Qualification

اس قابل نہیں اس لئے ان کو نہیں لیا جاتا۔ لیکن پولیس کی نوکری ہے، فوج کی معمولی درجے نوکریاں ہیں، دفتروں میں کلرک ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی جگہ ہو اور ان کو دی جائے اور اس سے وہ انکار کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتراض [کہ مسلمان قومی دھارے سے الگ ہیں] ایک اعتراض برائے اعتراض ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اچھا ایک بات میں اور عرض کروں کہ ہمارے فاروقی صاحب نے فرمایا ہے کہ [مسلمانوں میں اذعان اور یقین کی ایک کیفیت پیدا ہونی چاہئے۔ اور اذعان اور یقین کے پیدا ہونے سے ہمارے بہت سے مسایل حل ہو جائیں گے، اور مولانا کی بھی یہی تعلیم تھی کہ یقین کی کیفیت پیدا کی جائے۔ مجھے اس وقت یاد آیا کہ ڈاکٹر اقبال بھی جگہ جگہ یہ کہتے ہیں کہ یقین پیدا کرو:

یقیں پیدا کر اے غافل، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

میں سمجھتا ہوں کہ یقین بہت بڑی نعمت ہے، اور یقین ضرور پیدا ہونا چاہیے۔ لیکن یقین کیسے پیدا ہو؟ قرنِ اول، جس کا فاروقی صاحب نے ذکر کیا ہے کہ ہمارا عہد وسطیٰ جو ہے اس کو چھوڑ کر قرنِ اول کی طرف رجوع کریں مسلمان! اس زمانے کی جو Simple اور سادہ زندگی تھی اس کو اختیار کریں تو شاید یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ لیکن مجھے [اس سے] اختلاف ہے، اس لئے کہ وہ زمانہ جو تھا اس میں اسلام کے جو لوگ مخاطب تھے اس میں ان کو جنت کا تصور دیا گیا۔ ان کی نیک عملی کے نتیجے میں، ان کو بتلایا گیا، کہ تم کو جنت ملے گی، اور ان کی بد عملی کے نتیجے میں، بتلایا گیا، کہ دوزخ ملے گی تم کو۔ تو دوزخ کا ڈر، جنت کی طلب اور اس کی خواہش، یہ چیزیں تھیں جو مسلمانوں کے اندر یقین پیدا کر دیتی تھیں، نمبر ایک۔ نمبر دو یہ کہ جو آپ کا مشن تھا یعنی خدا کی پرستش اور توحید، میں سمجھتا ہوں کہ یہ زیادہ طاقت ور تھا، زیادہ Strong تھا، ان لوگوں کے

طریق زندگی کے مقابلے میں جو بت پرستی کرتے تھے۔ کعبہ کے اندر ۳۶۰ یا کتنے، ۳۶۵ بت رکھے ہوئے تھے۔ تو یقیناً مسلمان سمجھتے تھے کہ وہ زیادہ ترقی یافتہ ہیں ان لوگوں کے مقابلے میں جو پتھروں کے سامنے اپنا سر جھکاتے ہیں، دریاؤں کو، پہاڑوں کو [اور] ان چیزوں کو اپنا خدا مانتے ہیں۔ تو میرا خیال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کا اس وقت بھی یہ عقیدہ تھا کہ ہم زیادہ ان سے ترقی یافتہ ہیں، یہ ان کو یقین تھا۔ اور دوسرے نمبر پر یا بعد الطبیاتی کیفیت جو تھی ــــــ یعنی جنت کا اور دوزخ کا تصور، اس کے اوپر ان کو یقین تھا لیکن آج اور حضرات کا نہیں کہہ سکتا، میں خود اپنا عرض کرتا ہوں، نہایت صفائی کے ساتھ کہ میرے سامنے اگر کوئی شخص جنت کا بیان کرتا ہے، یا جنت کے مکانوں کا بیان کرتا ہے یا ان کی چوکھٹوں کی لمبائی چوڑائی بیان کرتا ہے، تو مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔

نورالدین: حور و غلمان سے تو ہوتی ہے!

نقوی: حور و غلمان سے بھی نہیں ہوتی۔

دوزخ کا Descriptior ہے، مجھے اس کا قطعاً کوئی خوف نہیں ہے۔ تو میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ یقین کی جو کیفیت ہے، کیسے پیدا ہوگی؟ اور شاید جو بات میں عرض کر رہا ہوں، وہ صرف میرے ہی دل کی بات نہیں ہے، بہت سے حضرات کے دلوں میں ہوگی، لیکن کہنے کی جرأت ہونا، یہ دوسری بات ہے۔ بہت سے حضرات بھی جن کا کاروبار ہی ہے دوسروں کو جنت کی ترغیب دلانا اور دوزخ کا ڈر دلانا، یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ باتیں وہ مانتے ہیں یا نہیں، لیکن دوسروں سے وہ کہتے یہی ہیں۔

تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد میں بھی غالباً جو بات پہلے رہی ہوگی شاید اس میں کسی حد تک کمی ہو گئی ہوگی۔ وہ نہ جنت کے اتنے طالب تھے نہ دوزخ سے اس قدر خائف تھے، تو ان چیزوں کی طرف بھی کچھ اشارہ ملنا چاہیے۔ اور اس وقت ایمان و

یقین کی کیفیت کیسے پیدا ہو؟ نہ اس کا حل مولانا نے بتلایا، نہ ہمارے فاضل مقالہ نگار نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔

مالک[۱] رام

مجھے صرف ایک مسئلے سے متعلق کچھ عرض کرنے کی جرأت ہوئی ہے۔ وہ وحدتِ ادیان کا مسئلہ ہے۔ میرے اپنے خیال میں اس مسئلے سے متعلق بہت غلط فہمی ہے۔ مولانا نے وحدتِ ادیان کا لفظ بایں معنی کہیں استعمال نہیں کیا کہ سب مذہب ایک ہیں۔ لیکن بعض لوگوں نے کچھ مصلحتوں کے ماتحت، بیشتر وہ لوگ جو ان کے سیاسی لحاظ سے مخالف تھے اور چاہتے تھے کہ عام مسلمانوں میں ان سے متعلق غلط فہمی یا بدگمانی پیدا کی جائے، انھوں نے، یہ ایک حربے کے طور سے استعمال کیا۔ لیکن بنیادی طور پر مولانا نے جو کچھ کہا وہ بالکل وہی ہے جو قرآن بار بار کہتا رہا ہے۔ قرآن کہتا ہے — اور اس کے مخاطب یقیناً ساتویں صدی کے عرب اور باقی دنیا تھی، وہ یہ کہ یہ نبی، رسولؐ کوئی نئی چیز نہیں لایا ہے، یہ وہی چیزیں ہیں جو وہاں ابراہیمؑ، اور اس سے پہلے نوحؑ، ابراہیم کے بعد یعقوبؑ اور ان کی اولاد لا چکی ہے] — یہ سب انبیاء کے نام ہیں، یقیناً وہ دوسرے انبیا کے نام بھی لے سکتے تھے لیکن چوں کہ عرب اور عرب کے جوار کے ممالک ان انبیاء کے

---

[۱] مالک رام: اردو داں طبقے کے لیے ان کا نام محتاج تعارف نہیں۔ پہلے حکومت ہند کی وزارت تجارت سے منسلک تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ساہتیہ اکیڈمی سے وابستہ ہو گئے۔ اب ایک کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ آپ مولانا آزاد کی کئی کتابیں اڈیٹ کر چکے ہیں

نام نہیں جانتے تھے اس لئے یہ کہہ دیا کہ تمام ملکوں میں، تمام قوموں میں نبی ہم نے بھیجے ہیں، جن کا ذکر یہاں ہم نہیں کر رہے ہیں۔ اور یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے جن نبیوں کا نام ہم نے لیا ہے، یہ بھی کوئی نئے دین کے حامل نہیں ہیں۔ تمام دنیا کے انبیا اسی دین کو لے کر آتے رہے، جو نبی محمد علیہ السلام لائے ہیں۔

تو پہلی بات تو یہ ہوئی کہ کوئی نیا دین نہیں لایا گیا تھا۔ شریعت کا لفظ نقوی صاحب [عبدالخالق نقوی] نے کہا ہے۔ میں اس پر بھی دو لفظ کہہ دوں گا۔ لیکن بنیادی طور پر دین شرد عاسے لے کر ایک رہا۔ اور قرآن کہتا ہے یہ اسلام رہا۔ اس دین کا نام وہ اسلام کہتا ہے، جو تمام انبیا لائے۔ [نورالدین: دین حنیف] حنیف آپ کہتے ہیں چلو حنیف ہی سہی، ہمیں کوئی ڈر نہیں۔

تو مقصد یہ ہے کہ اسی بات کو مولانا آزاد بار بار دہراتے رہے کہ دین ایک ہے۔ آپ ایک دین کے ماننے والے کو ہندو کہہ دیں، یا عیسائی کہہ دیں، اس سے دین نہیں بدلتا۔ مثال کے طور پر جیسے ہمارے یہاں سوسائٹیاں ہیں — کتنی ہی مذہبی سوسائٹیاں بھی ہیں۔ لیکن ان سوسائٹیوں کا ممبر بن جانے سے ان کے بنیادی اعتقادات نہیں بدل جاتے۔ خود انھوں نے کہا دو موقعوں پر ایسا ہوا، ایک تو خود قرآن میں ہے ایک حدیث میں آتی ہے بات۔ قرآن میں یہ ہے کہ آؤ ہم میں اور تم میں سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ جو ایک بات ہے اس پر ہم متفق ہو جائیں، تو وہ کیا بات ہے؟ وہ یہی دین تھا، جس پر وہ دونوں متفق ہو سکتے تھے۔ باقی فروع ہیں، جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر جب مدینہ ہجرت کے بعد [پیغمبر اسلام] گئے ہیں تو یہودیوں سے معاہدہ کیا ہے۔ اور اس معاہدے میں أُمَّةً وَاحِدَةً وہاں لفظ ہے۔

تو اس معاملے میں بہت غلط مبحث ہو گیا ہے کہ مولانا نے وحدت ادیان کا جو لفظ استعمال، جیسا کہ میں نے عرض کیا مخالفوں نے، سیاسی مخالفوں نے،

ان کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کے لئے، لوگوں میں انھیں Discredit کرنے کے لئے اس قسم کی باتیں پھیلائیں۔

شریعت یقیناً ایک ہے، اس میں کوئی شبہ کی بات نہیں ہے۔ دین کے حصے تین ہیں، ہر دین کے حصے تین ہیں۔ بلکہ میں تو مانتا ہوں کہ ایک ہی دین ہے۔ وہ یہ کہ ایک تو بنیادی معتقدات ہیں، خدا ایک ہے۔ اس کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے وحی الہام ہوتی ہے۔ اس کے لانے والے، اس کے حامل نبی ہوتے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ہر زبان کے الفاظ الگ الگ ہوں گے۔ اس زبان میں انہی باتوں کو الگ الگ لفظوں سے تعبیر کیا جائے گا۔ دوسرا حصہ شریعت کا ہوتا ہے۔ پہلی چیز معتقدات ہوتے ہیں جو تمام مذاہب میں ایک سے ہیں۔ شریعت ہر زمانے کے حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے اور بدلتی رہے گی۔ اب بھی بدلتے ہیں قانون۔ انگریزوں کے زمانے میں یہاں کا ایک قانون تھا، اب ہم اپنے حالات کے مطابق اسے بدل رہے ہیں۔ یہ لوک سبھا اور راجیہ سبھا جو پاکھنڈ ہوتے ہیں، سب اسی لئے ہیں کہ ضرورت کے مطابق آپ لوگوں کو راستہ دکھائیں یا گمراہ کریں [قہقہہ]۔

اور تیسری چیز ہر مذہب میں —— اب میں یہ بات کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈر اس لئے نہیں ہے کہ میری کون سی ایسی حیثیت ہے کہ میں ڈروں۔ وہ ہے پیشین گوئیوں کا حصہ۔ ہر مذہب میں پیشین گوئی ہے، اپنے سے بعد کے آنے والے زمانے کے متعلق۔ اور یہ دراصل دو دھاری تلوار ہے۔ ایک تو دوسرے لوگوں کو اس مذہب کی صداقت کا یقین دلانے کے کام آتی ہے۔ دوسرے ان لوگوں کا جو اس مذہب کے ماننے والے ہیں اس مذہب پر اعتقاد اور راسخ ہو جاتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں۔ وضاحت کے لئے ایک مثال دوں، قرآن میں فرعون کے متعلق ہے

ہم فرعون کی لاش کو آخر ایام میں پھر نکالیں گے۔ آپ میں سے جن حضرات نے دیکھا یا پڑھا ہو کہ قاہرہ کے میوزیم میں [اسی] فرعونِ موسیٰ کی ممی ہے جو غرق ہو گیا تھا۔ ان کو چھوڑ دیجئے۔ خود عہد نامۂ قدیم میں توراۃ کے [مطابق] فرعون دریا میں غرق ہو گیا لیکن وہ دریا سے نکالا گیا، اور پھر مدتوں کیا صدیوں کے لئے اس کی لاش پھر ب ہو گئی، اور پھر وہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی Archeological Excavations زمانے میں وہ پھر نکلی اور پھر آگئی۔ تو اس سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے ان لوگوں کا جو مذہب کے، یا اس کتاب کے، یا اس وحی کے ماننے والے ہیں، اور مخالفوں پر ایک حجت ہو جاتی ہے کہ دیکھو یہ ایک بات کہی گئی تھی آج سے بارہ تیرہ سو سال پہلے، اس وقت جب کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا، کہ یہ بات ہونے والی ہے یا ہو سکتی ہے۔ اور وہ بات جب پوری ہو جاتی ہے تو ان لوگوں کے لئے ایمان کی مضبوطی کا باعث ہو جاتی ہے اور مخالفوں پر حجت ہو جاتی ہے۔

تو میرا مقصد یہ تھا کہنے کا کہ وحدتِ ادیان کا مقصد مولانا کا یقیناً یہی تھا اور ان کا بھی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مولانا نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے۔ قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام لوگ ایک ہی دین مانیں یا مانتے ہیں۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ میں نے دین ایک اتارا ہے۔ جب بھی نازل کیا، ایک ہی دین کیا، جس کے متعلق میرے مکرم نور الدین صاحب فرما رہے ہیں کہ دین حنیف کیا، تب اچھا ہے۔ لیکن یہ بات کہ اس کے معنی کیا لیے گئے؟ یہ کہا گیا کہ مولانا کہتے ہیں کہ ہندو بھی ایسا ہی ہے، عیسائی بھی ایسا ہی ہے، ایسا کہ مسلمان ہیں یہ اس کے معنی پہنائے گئے۔ یہ بات نہیں تھی۔ قطعاً ان کا یہ مقصد نہیں تھا۔ مقصد ان کا یہ تھا — خود حدیث میں ہے کہ جس شخص نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہا، وہ ناجی ہے، نجات پا گیا۔ تو یہ کم سے کم اعتقاد کی چیز ہے۔ اب باقی رہ گئی رسالت، تو وہ مسئلہ الگ ہے۔

نثار احمد فاروقی[1]

اس ڈِس کُس شن (Discussion ۔ بحث) میں میں یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ مسلمانوں کی موجودہ حالت پر ہے یہ سمپوزیم ، یا مولانا آزاد پر ہے ، یا وحدتِ ادیان پر ہے ، یا سیکولرزم پر ہے ، یا اس کا موضوع کیا ہے ، یہ میں نہیں سمجھ سکا اس لئے کہ ۔ [ایک آواز : اس لئے کہ دیر سے تشریف لائے آپ ۔ ایک اور آواز : موضوع ہے Relevance of Maulana Azad] بہرحال میں نے اس ڈِس کُس شن میں یہ دیکھا کہ جو فاضل مقررین آئے ان کی تقریریں اپنی اپنی جگہ سب کی بہت اچھی تھیں ، لیکن باہم ان میں کوئی ربط مجھے نظر نہیں آیا ۔ ایک دوسرے کی نہ تائید کرتی ہیں ، نہ کاٹتی ہیں ۔ تو میرے ذہن میں بہرحال یہ تھا کہ مسلمانوں کے موجودہ سیاسی مسائل سے متعلق ہوگا غالباً

تو میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ مولانا آزاد کے اس سلسلے میں جو کچھ بھی نظریات تھے ، وہ اچھے تھے یا برے ، لیکن یہ ضرور ہے کہ ، وہ ان میں ناکام ہو گئے ۔ اور بری طرح ناکام ہوئے ۔ یہ واقعات ہیں جن کا انھوں نے خود India Wins Freedom میں اعتراف کیا ہے ۔ اور ان کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے جو دو الیکشن لڑے ہیں وہ اس علاقہ سے لڑے کہ جہاں مسلم ووٹ بیلنسنگ پاور (Balancing power ۔ توازن پیدا کرنے کی حیثیت) میں تھے ۔ اگر مولانا آزاد مثلاً پونا سے جا کر الیکشن لڑتے ، یا ہردوار سے لڑتے ، یا وہ کسی اور کانسٹی ٹوانسی (Constituency ۔ حلقۂ انتخاب) سے لڑتے جہاں دو فی صد یا پانچ فی صد

---

[1] نثار احمد فاروقی استاد شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی

مسلم ووٹ ہوتے ، اور وہ سیکولرزم کے نام پر یا کانگریس کی ترقی پسندانہ پالیٹکس کے نام پر وہاں سے کامیاب ہو کر آجاتے ، تب میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اپنی زندگی بھر کی جدوجہد میں کامیاب رہے ۔ بہرحال میرا تو یہ خیال ہے ۔ [ایک آواز : عبدالغفار خاں پنجاب اور پھر ہریانہ میں ۔ مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں]

ایسی مثالیں تو استثنا ہیں ۔ اور ان کی جو فیملی کے حالات ہیں ، وہ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں ۔ وہ اس کے سوا کہیں اور لڑ بھی نہیں سکتے ؛

اور موجودہ حالات ' سیاسی جو ہیں مسلمانوں کے ، ان کے لئے میں یہ سمجھتا ہوں ، یہ میری ناقص رائے ہے ، میں ناقص کو بہت زور دے کر کہہ رہا ہوں [ایک آواز : صحیح ہے] کہ یہ مسائل ان لوگوں کی وجہ سے زیادہ ہیں کہ جنھیں مسلمانوں کا لیڈر سمجھا جاتا ہے ، یا جو مسلمانوں کے لیڈر بن کر پہنچ گئے ہیں ، یا سامنے آتے ہیں ۔ میں نہیں سمجھتا کہ پارلیمنٹ کے ممبروں میں ، جتنے ممبر ہیں ، ان میں سے ایک کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ سرخروئی کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ میں مسلمانوں کا لیڈر ہوں [ایک آواز : پارلیمنٹ میں کوئی بھی اس حیثیت سے نہیں جاتا] یا ہماری کیبنٹ میں یا ہمارے اسٹیج پر کوئی شخص آپ نہیں بتا سکتے کہ وہ متفقہ طور پر مسلمانوں کا لیڈر رہے ۔ اور آج کے دور میں مولانا آزاد نے جو اس مسئلہ کا حل تلاش کیا تھا لکھنؤ کی کانفرنس میں ، کہ انھوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ سیاست سے علیحدہ ہو جائیں [1] میں سمجھتا ہوں کہ یہ حل بہت

---

[1] لکھنؤ کی مسلم کانفرنس (جنوری ۱۹۴۸ء) کا نہ تو یہ مقصد تھا ، اور نہ مسلمانوں کو اس طرح کا کوئی مشورہ ہی مولانا نے دیا تھا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کانفرنس میں صرف یہ فیصلہ کیا گیا تھا ، اور اسی مقصد کے لئے یہ بلائی بھی گئی تھی ، کہ مسلمان مذہبی بنیادوں پر اپنی کوئی سیاسی پارٹی نہ بنائیں ، اور ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں میں اپنے اپنے طبقاتی مفاد کے مطابق شامل ہوں ۔

لکھنؤ کانفرنس کے سلسلے میں یہ بھی قابل ذکر ہے ، جسے اب شاید لوگ بھول گئے ہوں

(باقی اگلے صفحہ پر)

اچھا تھا بشرطیکہ [وہ اپنے آپ کو سیاست سے] بالکل الگ کر دیتے۔ لیکن
یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کی باگ ڈور اُن لوگوں کے ہاتھوں میں دے دی ہے کہ جو اگر
لوگوں کے ہاتھ میں رہتی تو اس سے بہتر رہتی۔

تنویر احمد علوی[1]

مجھے صرف ایک پہلو پر ایک بات عرض کرنی ہے، وہ یہ کہ، کہا گیا کہ، جب
اسلام یہاں آیا، اس وقت سے لے کر انگریزوں کی آمد تک کبھی اس امر کی کوشش نہ
کی گئی کہ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کو سمجھیں۔ مقالہ نگار نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، اور
کی زبان یا زبانِ قلم نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ میں تاریخ کا ایک معمولی طالب علم رہا ہوں
مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ایک نے دوسرے کو سمجھا ہے؛ ہماری مختلف مذہبی تحریک
تہذیبی تحریکیں، یہاں تک کہ اہلِ تصوف کی تحریکیں، ان کا نقطۂ نظر، ان کی اپنی زند
اور ہمارا جو ایک تہذیبی ڈھانچہ اس عرصے میں بنتا رہا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے
ہم نے ایک دوسرے کو سمجھا تھا اور اپنے اندر ایک خاص قسم کی رواداری پیدا کی
اور اسی کے تحت ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ پچھلے دنوں ایک کا
میں مجھے بھی شرکت کا اتفاق ہوا تو وہاں یہ مسئلہ آیا کہ ہندو اور مسلمانوں میں اختلاف

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۵) کہ مولانا آزاد ایک نئی پارٹی "اتحاد و ترقی" کے نام سے بنانا چاہتے
اس کے ابتدائی دو تین جلسے بھی ہوئے اور اس کا دستور بھی مرتب ہو گیا۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر
کی تفصیلات موجودہ بحث سے خارج ہیں، یہ پارٹی باضابطہ معرضِ وجود میں نہ آسکی (مرتب)

[1] ڈاکٹر تنویر احمد علوی دہلی کالج کے شعبۂ اردو میں اُستاد ہیں۔

سبب کیا ایک دوسرے کو نہ سمجھنا ہے یا یہ کہ واقعتاً اسلام اور ہندوازم ایک دوسرے کے مقابل میں اس طرح سے واقع ہوئے ہیں کہ دونوں کا ایک دوسرے سے جنگ کرتے رہنا ضروری ہے؟ میرے خیال سے یہ دونوں باتیں نہیں۔ انھوں نے ایک دوسرے کو سمجھا ہے اور ہم ہندو اور مسلمانوں میں ایسا کوئی اختلاف تاریخی طور پر نہیں ثابت کر سکتے جس نے ان کو مسلسل جنگ میں مبتلا رکھا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز نے ہماری تاریخ کو بگاڑنے کی کوشش کی اور بد قسمتی سے ہمارے ہسٹورینس (Historians مورخین) نے بھی اس بگڑی ہوئی شکل کو اُسی شکل میں پیش کیا اور کہا کہ یہی اصلی شکل ہے۔ اس وجہ سے اختلافات کی خلیج بڑھتی رہی۔ یہ اختلافات کی خلیج ہم ریاستوں (سابق کی دیسی ریاستوں) میں نہیں دیکھتے۔ بس، ہم تک ہمارے یہاں بہت سی ریاستیں تھیں۔ ان میں بیشتر ہندو ریاستیں تھیں۔ ہندو اکثریت میں تھے لیکن ریاستوں میں کوئی فتنہ وفساد اور اختلاف نہیں تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دو طبقوں کے درمیان بنیادی اختلاف سرے سے کوئی نہیں تھا۔ یعنی سماجی طور پر وہ ایسا گروہ ہیں کہ جو ایک دوسرے سے نظریاتی یا عقائد کا اختلاف رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے عادی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ اور محبت ہمیشہ رکھی ہے، اور آج بھی وہ رکھ سکتے ہیں۔

اس لئے اس معاملے کو اس طرح نہ پیش کیا جائے کہ ہم نے ایک دوسرے کو نہیں سمجھا۔ ہاں آج اس کی ضرورت بے شک زیادہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پہلے سے بہتر سمجھیں۔ اس لئے کہ ہمیں غلط طور پر ایک دوسرے کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

اقتصادی مسایل پر مقالہ میں غالباً کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی، کہ مسلمانوں کا اس ملک میں کوئی اقتصادی مسئلہ بھی ہے۔ اور اس کے لئے ابوالکلام آزاد ہم سے کیا چاہتے تھے، اور کس طرح چاہتے تھے۔

قاضی سجاد حسین[1]

مقالہ کی ابتدا میں ایک پوائنٹ (Point) کچھ اس طرح کا آیا جس کی وضاحت ہونی چاہیے تھی، اور اس کی وضاحت نہیں ہوئی۔ شروع مقالہ میں جو انداز ضیا صاحب نے اختیار کیا ہے وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ہندستان میں مسلمان آزادی کی تحریک اور جدوجہد میں بالکل خاموش تھے، اور برسرِ پیکار نہیں تھے، اور یہ کہ صرف مولانا نے چند انقلابی جماعتوں سے معاہدہ اور مفاہمت کر کے اس میں شرکت کی اور اس کے بعد مسلمانوں کو ادھر لائے۔ یہ تشریح طلب ہے بات، اور اس کی وضاحت طویل ہے۔ مولانا کا کسی تحریر سے یہ منشا ہو کہ وہ موسس اول ہیں اس چیز کے، اور مسلمانوں میں ابتدائی طور پر ان ہی نے یہ روح پیدا کی، اور اس سے پہلے غیر ملکی تسلط کے خلاف جدوجہد ہندستان میں نہیں تھی، یہ شاید علمی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ اور شاید مولانا کا بھی یہ منشا نہو۔ تو یہ پوائنٹ زیادہ واضح ہونا چاہیے۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے جو ہندستان میں پیدا ہو رہا ہے اور جو تاریخی اعتبار سے بہت بڑا مغالطہ ہے ؛ اس لئے کہ ہندستان کے اندر مسلمانوں کی جو ایک پوری انقلابی جدوجہد رہی ہے، اس کو کاٹ دینا اور یہاں سے اس کو جوڑنا اور شروع کرنا، یہ تاریخی اعتبار سے غالباً صحیح نہیں ہے

اس سے پہلے جو انقلابی تحریکیں یہاں رہیں، یہ صحیح ہے کہ ان کی اس طرح کی

---

[1] صدر مدرس مدرسہ امینیہ (دہلی) نائب متولی ہمدرد وقف دہلی

نوعیت، کہ مشترکہ جماعتیں رہی ہوں اور کانگریس کی جو بنیادی چیزیں تھیں اس طرح کی کوئی تشکیل ہوئی ہو، یہ تو نوعیتیں نہیں تھیں۔ لیکن انفرادی تحریکیں، ہندستان سے انگریزوں کو دفع کرنے کے لئے اور اجنبی تسلط کو رفع کرنے کے لئے برابر چل رہی تھیں۔ ریشمی خطوط کی تحریک، اور حضرت شیخ الہندؒ، اور اس سے پہلے سید احمد شہیدؒ کی جماعت، یہ ساری چیزیں ان واقعات سے بہت پہلے ہیں۔ صورت اور نوعیت بدلتی رہی؛ لیکن مسلمانوں کا کسی وقت بھی اس اجنبی تسلط کو برداشت کرنا، اور بالکل راضی ہو جانا، یہ چیز نہیں ہے [ایک آواز: سوائے علی گڑھ کے!]۔

دو باتیں اور سامنے آئیں۔ اس پر جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا وہ، خدا جزائے خیر دے مالک رام صاحب کو، انھوں نے بہت کچھ کہہ دیا۔ ورنہ مولانا کے سلسلے میں وہ بہت بڑا مغالطہ پیدا ہو رہا تھا۔ جہاں تک مولانا کی تعلیمات ہیں [ایک آواز: مالک رام صاحب نے جو کچھ فرمایا] اس کا احترام اپنی جگہ پر، لیکن ادیان کا لفظ جب آپ استعمال کرتے رہیں گے تو قرآن دین کے لئے تو کھلم کھلا کہہ رہا ہے کہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ!] اصل میں مولانا کے خلاف جب یہاں سیاسی معاملات پیدا ہونا شروع ہوئے اور ان کی قیادت کی مخالفت ہوئی تو ایک مسئلہ تو قومیت کا تھا کہ جس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہی گئیں اور ان کے خلاف کچھ باتیں ہوئیں۔ اور دوسرا مسئلہ وحدتِ ادیان کا تھا۔ جیسا کہ مالک رام صاحب نے بتایا۔ مولانا کا جو ایک قومیت کا تصور تھا، وہ وہ تصور نہیں تھا جو یورپ کی ایک اصطلاح خاص جس کے اندر تمام کلچروں، تمام تہذیبوں اور تمام دینوں کا کچومر نکال کر کوئی ایک چیز بنائی جائے، بلکہ متحدہ قومیت کا تصور مولانا کا ایک بہت وسیع تصور تھا جس کے اندر وہ اپنے ادنیٰ کلچر اور اپنی تہذیب کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور پھر سب سے بڑھ کر کے یہ کہ مقالہ میں ایک مسئلہ تشنہ رہ گیا۔

ایک تو وحدت ادیان کا یہ تصور جو ہندستان کے اندر مختلف تہذیبوں میں پہلے آیا کہ اللہ تک پہنچنے کا جو راستہ ہے وہ آپ نماز روزے سے طے کریں، اسلام جس کو شریعت ہم کہتے ہیں، اس راستے سے طے کریں وہ بھی ٹھیک ہے، اور کوئی اور مذہب ہو، شریعت ہو اس راستے سے طے کریں وہ بھی ٹھیک ہے! وحدت ادیان کا یہ تصور ہندستان میں بہت سی سوسائٹیوں میں، بہت سی تحریکوں میں پیدا ہوا، تو مولانا کے بارے میں بھی مقالہ نگار نے غالباً کچھ اسی قسم کی بات کہہ دی کہ مولانا کے یہ تصورات تھے، حالانکہ مولانا کے نہیں تھے۔

آں حضورؐ نے خود یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "نحن معشر الانبیاء ابونا واحد وامھاتنا شتی" کہ جتنے بھی انبیاء آئے ہیں ان کو یہ سمجھئے کہ وہ ایک باپ کی اولاد ہیں، اور مختلف ماؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ تو جہاں تک دین کا تعلق ہے وہ تصور کہ جو مالک رام صاحب نے پیش کیا کہ جس کے اندر توحید خالص، نبوت کا تصور، آخرت کا تصور، اور یہ تمام مذاہب کے مشترک بنیادی اصول ہیں، یہ ہے ایک تصور دین کا۔ اس کے بارے میں حضورؐ برابر یہ فرماتے رہے کہ میں کوئی نئی چیز لے کر نہیں آیا، جیسا کہ فرما رہے تھے مالک رام صاحب، وہی آیت کہ "تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم ..... من دون اللہ" تو یہ وحدت کا تصور، تو دوسرے بھی اس کے مدعی تھے اور مولانا، بھی تھے۔ لیکن وحدت ادیان کا یہ مطلب کہ تمام شریعتوں کو مولانا نے ایک کر دیا ہو، اور یہ تصور ہو کہ جس شریعت اور جس بنیاد پر چاہیں آپ عمل کریں یہ مولانا کا تصور نہیں تھا۔

کوثر چاندپوری[1]

میں سمجھتا ہوں کہ مقالہ نگار کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم نظریاتی بحثوں میں پڑیں یا علمی بحثوں میں الجھیں، ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ہمارے مسائل جن سے آج ہم دوچار ہیں، ان کو اس مجلس میں زیر غور لایا جائے۔ جہاں تک مولانا آزاد کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کا سوال ہے اور جہاں تک ان سے روشنی لینے کا سوال ہے، میں سمجھتا ہوں اس حد تک بنیادی طور پر یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ہر مسلمان ہندستان کی قومیت کا زندہ، فعال اور سرگرم جزو ہے۔ صرف اس حد تک سمجھ لینا کافی ہے۔ اس کے بعد کے مسائل کو ہم خود طے کریں گے۔ یقیناً کوئی ایک مصنف اپنے دور میں بہت زیادہ دانش ور ہوتا ہے، بہت زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے۔ لیکن وہ آئندہ زندگی کے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا اور کسی مصنف، ادیب یا سیاسی مفکر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ دنیا کا آخر تک احاطہ کر لے گا، میرے خیال سے بالکل صحیح نہیں ہے۔ ہر زندہ قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ آج کے مسائل کو خود طے کرے۔ ابھی ابھی یہ کہا گیا کہ زندگی ایک بڑی متحرک چیز ہے، وہ جامد نہیں ہے۔ یہ تصور بالکل ٹھیک ہے۔ زندگی کو جامد نہیں کہا جا سکتا۔ زندگی درحقیقت ایک قسم کی تلاش ہے، ایک قسم کی کوشش ہے، جو ہر لمحہ کائنات میں جاری اور ساری رہتی ہے۔ اور اس کا مقصد صرف ایک ہے، یعنی انسان کے لئے اور انسانیت کے لئے فلاح کا تلاش کرنا۔ ایک بات مولانا ناظم جلالی صاحب نے بہت معقول کہی۔ وحدت ادیان کی۔ میں اسے دہراؤں گا نہیں۔ مولانا ناظم صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہر مذہب کا مقصد یہ ہے کہ وہ معاشرے سے ظلم کو دور کرے۔

---

[1] حکیم سید علی کوثر چاندپوری سپرنٹنڈنٹ ہمدرد کلینک نئی دہلی

بات ٹھیک ہے۔ الفاظ بدلتے ہیں لیکن ان کا مقصد یہی ہے کہ معاشرے سے ظلم اور جور اور تعدّی کو دور کرنا چاہئے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں ظلم کا اور طغیان کا عنصر بہت غالب آگیا ہے، اور اسی وجہ سے ہماری اس مسلم اقلیت کو بہت زیادہ دشواریوں کا مقابلہ ہے۔ اور سمینار کا مقصد یہی تھا کہ ان مسائل کو ہم سامنے رکھیں اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے ان مسائل کو ہم طے کریں جن سے آج ہم دوچار ہیں میں نے جیسا کہ پہلے کہا اس اصل موضوع کو بہت کم چھیڑا گیا۔ ہمارے نثار احمد صاحب فاروقی نے ایک بہت کام کی بات کی اور اس بحث کو تھوڑا موڑ دیا۔ ورنہ ہم نظریاتی بحثیں کرتے رہتے جو بہت پہلے سے ہوتی رہی ہیں جو کبھی کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچیں۔ نظریاتی بحثیں، منطقی بحثیں، فلسفیانہ بحثیں، ہمارے اسلامی معاشرہ میں ہر دور میں ہوئیں، لیکن کبھی کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اصل موضوع ہمارے قومی مسائل، جس پر اب تک بات نہیں ہوئی، اس پر اسی حد تک ہی بات کرلیں جس حد تک مولانا دائم جلالی صاحب نے کہا ہے کہ: ہر مذہب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے سے اپنے سماج سے، اپنے نظام سے ظلم کے، جور کے رجحانات کو دور کرے اور ان کی ہمت افزائی نہ کرے۔ اس مجلس میں صرف اگر اتنی سی بات پر غور ہو جائے کہ ہمارے موجودہ معاشرے میں جو اس قسم کے رجحانات ابھر آئے ہیں انھیں ہم کس طریقے سے دور کریں اور اپنی زندگی کو کس طریقے سے پرسکون بنائیں؟ ظاہر ہے کہ کوئی جمہوریت اور کوئی مملکت اس وقت تک ترقی ہی نہیں کرسکتی جب تک اس میں اندرونی طور پر اطمینان اور سکون نہ ہو اور جب تک پورے طور پر ہم آہنگی اور اجتماعی تصورات کی فراوانی نہ ہو۔ ہمارے معاشرے میں یہ بات نہیں ملتی ہے۔ ہم ایک تصور رکھتے ہیں، کہ ہم ہندستانی جمہوریت کا ایک جزو ہیں اور میں پھر اصرار کے ساتھ کہوں گا کہ

ہم کوئی گلا سڑا جز نہیں ہیں کہ ہمیں معاشرے سے کاٹ کے پھینک دیا جائے۔ ہم زندہ جز ہیں اس جمہوریت کا، اور فعال جز ہیں اور سرگرم جز ہیں۔

ابھی ابھی ایک بحث آئی تھی مسلمانوں کی تحریکِ آزادی میں شرکت کی۔ میں سمجھتا ہوں وہ بحث ذرا تھوڑی سی نامکمل رہ گئی۔ مسلمانوں نے صرف انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمارے پاس ایسے تاریخی اسناد بھی موجود ہیں مسلمانوں نے خود مسلمانوں کی ظالم حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مسلمان اتنی جری قوم ہے کہ وہ کبھی غلامی کو پسند نہیں کرتی، عام اس سے کہ وہ غلامی مسلمانوں ہی کی لادی ہوئی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ہندستان میں اصل تحریکِ آزادی جو شروع ہوئی ہے، وہ شاہ ولی اللہؒ کے دور سے شروع ہوتی ہے۔ وہی جس تحریک کا ابھی مولانا سجاد حسین صاحب نے تذکرہ فرمایا تھا، اس تحریک یعنی ریشمی خطوط کی تحریک کا سرا شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ہی اس تحریک سے ملتا ہے۔ اور وہ دور وہ تھا کہ جب مسلمان حکمراں تھے ہندستان میں۔ مسلمانِ عالم کی ایک سب سے بڑی بے باکی اور اس کی جو بات یہ ہے کہ اس نے اس حکومت، ظالم حکومت سے، اس بے کار حکومت سے، اس مفلوج حکومت سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کی، اور اس تمام معاشرہ کو اس سے آزاد کرنا چاہا — یہ معمولی بات نہیں ہے اور اس میں مسلمان بھی شامل تھے، ہندو بھی شامل تھے۔

جہاں تک مقالہ نگار کی پوزیشن کا سوال ہے وہ بالکل واضح ہے اور بالکل صاف ستھری ہے۔ انھوں نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہی؛ زیادہ باتیں ان کی وہ ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات کی روشنی میں کہی گئی ہیں۔ اور میں مولانا آزاد کے متعلق یہ کہہ چکا ہوں کہ ہم بنیادی طور پر تو ان کی اس بات کو تسلیم کریں گے، لیکن جہاں تک ہماری زندگی کا تعلق ہے، ہمارے آج کا تعلق ہے، ہم ان مسائل کو خود طے کریں گے اور ہمیں خود ہی طے کرنا چاہیے۔ مولانا آزاد آج اپنی لحد مبارک سے ہمیں سہارا دینے نکلنے

کوئی آواز پیدا نہیں کریں گے، اپنے مسائل ہمیں خود ہی طے کرنا ہوں گے۔

کھیڑا[1]

مقالہ نویس نے بڑی محنت، پوری دیانت داری اور پورے شعور سے مقالے کو لکھا ہے۔ میں ان پوائنٹس — Points اور ان باتوں کی بحث میں نہ پڑوں گا جو کہ دین کے حصے میں آئی ہیں۔ لیکن فاضل مقالہ نگار کے اس خیال کو میں ضرور بحث طلب سمجھتا ہوں کہ ہم نے، ہندو مسلمانوں نے، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پائے — یعنی ہندوؤں نے مسلمانوں کو اور مسلمانوں نے ہندوؤں کو نہیں سمجھا۔ تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے، اور بتلاتی ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے، ہم ایک دوسرے کو سمجھنے ہی کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ بھائی بھائی کی طرح رہتے رہے ہیں۔ ہماری تاریخ میں ایک زمانہ ضرور آیا ہے جس میں ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنا چھوڑ دیا۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے تاریخ میں مجھے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ صدیوں سے

[1] گوپال داس کھیڑا، غیر منقسم ہندستان کے صوبہ سرحد کی سرخ پوش تحریک کے سرگرم کارکن اور خدائی خدمت گار رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد اب ان کا وطن دہلی ہے۔ عملی سیاسی کاموں سے زیادہ وہ اپنے کاروبار میں دلچسپی لیتے ہیں۔ فائنانس سروس (پرائیوٹ لیمیٹڈ) کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔

بلکہ ایک ہزار سال سے، ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسرے کو سمجھ نہ پائے تھے۔ آپ کے پاس مثالیں ہزاروں موجود ہیں، جہاں مرہٹہ سرداروں، راجاؤں کے پاس مسلمان بھائی جرنیل تھے، وہیں مسلمان راجاؤں کے پاس ہندو جرنیل، ہندو اڈوائزر بھی تھے۔ گویا نفرت کا بیج، اگر ہم زیادہ گہرائی میں جائیں، تو اس وقت پڑا جب انگریز ہندستان پر حکومت کرنے کے لئے آیا، یا جب سے ہندستان میں انگریزی حکومت مضبوط ہوئی۔

مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے ٹکراؤ، یا ہمارے تفرقات مذہب کی بنا پر نہیں، معاشی بنا پر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا اصلی ٹکراؤ اکنامک بے سس (Economic facter — معیشی بنیادوں) پر شروع ہوا، اور اس کو مذہب کے نام پر اکس پلائٹ (Exploit — ناجائز طور پر) کیا جاتا رہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ تناؤ کبھی بھی مذہب کی بنا پر تھا۔

جیسے ہی انگریزوں کا تسلط یہاں قائم ہوا، یہ بھی ہم کو ماننا پڑے گا، پہلی کوشش ملک کو آزاد کرانے کی مسلمانوں ہی نے کی۔ آزادی کی لڑائی میں سب سے زیادہ قربانی مسلمانوں نے کی۔ اس وقت وہ لوگ انگریزوں کے قریب تھے جو آج کل مجاہد سمجھے جاتے ہیں، یا اپنے آپ کو 'مجاہد' کہتے ہیں۔ پھر ایک ایسا دور آیا جب کہ اس تصویر کو الٹ دیا گیا، اور جب مسلمانوں کو پچھواڑے کی طرف جانا پڑا، اور انھوں نے [مسلمانوں نے] بھی انگریزوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی ایک ٹکراؤ تھا۔ اکنامک ٹکراؤ، اس میں بھی مجھے مذہبی ٹکراؤ نظر نہیں آتا۔ اسی لئے میں نے کبھی تسلیم نہیں کیا مذاہب انسانوں کو آپس میں لڑاتے ہیں، ہاں لوگ مذہب کو بہانہ بنا کر لڑتے ہیں۔ دراصل اب ہندستان میں جھگڑے کی جڑ مذہب نہیں، اکنامک فیکٹر، (Economic facter) پیٹ کا مسئلہ ہے۔

ہاں تو مسئلہ تھا ایک دوسرے کو سمجھنے کا۔ آپ پیچھے نہ جائیے۔ سو سال، دو سو سال یا تین سو سال پیچھے نہ جائیے۔ آج بھی آپ کسی چھوٹے سے گاؤں میں چلے جائیے تو وہاں ایک چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا آپ کو ضرور ملے گا، جسے شاملات کی زمین کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی نیا نہیں، بہت پرانا طریقہ ہے۔ پہلے بڑی حد تک مسلمان بھی اور ہندو بھی شاملات میں رہتے تھے۔ شاملات کی زمین پورے گاؤں کی ہوتی تھی، کسی ایک فرد کی نہیں، کسی ایک ہستی کی نہیں، کسی ایک مذہب کی نہیں۔ گویا ہمارا پرانا اقتصادی ڈھانچہ جو تھا گاؤں گاؤں کا، وہ ایسا ہی تھا اس میں ہم مطمئن تھے، ہم خوشی رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ہماری زمینیں بھی شاملات میں چلی گئی تھیں، اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی رہتے تھے۔ مل جل کر بوتے تھے، جوتتے تھے، کاٹتے تھے، ساتھ ہی اپنے اپنے طریقے پر عبادت بھی کرتے تھے۔ لیکن جب اسے اس مسئلے نے ہندوستان میں اقتصادی ٹکراؤ کی شکل اختیار کی، اور اسے شدت سے اکسپلائٹ (Exploit۔ استحصال) کرنے کی کوشش کی گئی، تب سے ہم نے سوچنا شروع کیا کہ ہم الگ الگ ہیں، اور تاریخ کا رخ موڑ کر اپنے بچوں کو [نفاق کا یہ سبق] پڑھانا اور نفرت کا بیج بونا شروع کیا۔ تب ہی سے ہم نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ مسلمان بابا آدم کی اولاد ہیں اور ہندو بابا آدم کی اولاد نہیں ہمارے نظریے علاحدہ علاحدہ، ہمارے راستے علاحدہ علاحدہ ہیں۔ اس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔

اور یہ کہنا کہ مسلمان قوم کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو رہی ہے، میں اس کو صریحاً غلط سمجھتا ہوں، کیوں کہ آج یہ ایک ہسٹارک فیکٹ (Historic fact) تاریخی حقیقت) ہے۔ جس طور سے پارٹی شن (Partition تقسیم) ہوا، اور اس وقت کے آج بڑے بڑے افسر بیٹھے ہوئے ہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ ان کے دماغ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا؟ ان کے دل میں کوئی خاص جذبہ نہیں؟ میں اس کو ماننے کے لئے

تیار نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے سامنے واقعی بہت سارے مسایل ہیں۔ لیکن اس کو بھی میں غلط سمجھتا ہوں کہ ہم میں ایک کمپلس (Complex احساس) پیدا ہو جائے اور ہم سمجھنا شروع کر دیں کہ ہمیں علاحدہ سمجھا جاتا ہے، ہمیں علاحدہ کرکے رکھا جا رہا ہے، ہم کوئی ایک جزو نہیں ہیں قوم کا۔ اس سے قوم کے بچوں میں، قوم میں، ایک کمپلس پیدا ہو جائے گا۔ اس کمپلس کو ہمیں دور کرنا ہے، اور اپنے آپ کو ملک اور قوم سے کبھی بھی علیحدہ سمجھنا نہیں ہے۔ ساتھ ساتھ آپس میں رہتے ہوئے اپنی معاشرتی اپنی اقتصادی زندگی کو، اپنی تمام چیزوں کو خود درست طور پر رکھنا ہے۔ لیکن ان سب چیزوں کو کرنے کے لئے اگر ہم اس کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں گے جو برسی پرانی باتوں کو آج کی نئی سائنسی ایجادات کو چھوڑ کے [اپنانا چاہتے ہیں]۔ ہمیں کہیں درمیانی ایجز۔ Middle Ages میں واپس لے جانا چاہتے ہیں، اگر اپنے اقتصادی اِی شوز (Issues - مسائل) کو بھی ان کے ہاتھ میں چھوڑ دیں گے، تو یہ تمام مسئلے آج جیسے موجود ہیں، مجھے یہ کہنے میں کوئی ڈر نہیں ہے، اس سے زیادہ خراب اس سے زیادہ بدتر ہو جائیں گے، اور ملک کی حالت اس سے زیادہ بگڑ جائے گی۔ اس لئے کہ کوئی بھی ملک جب تک جمہوری طور پر تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے بڑھنے کی کوشش نہ کرے، تب تک وہ ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ یہ کہنا کہ اس میں سے ایک فرقہ ترقی پسند ہو، ترقی کرے، اور دوسرا پچھڑا رہے، تو ملک بھی پچھڑا ہی رہے گا، ترقی یافتہ سمجھا نہیں جائے گا۔ اس لئے میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اس پر غور کریں۔ اور میں مقالہ نویس صاحب سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ بھی اس پر روشنی ڈالیں۔

ریاض شروانی[1]

ضیا صاحب نے اپنے مقالہ کے شروع میں یہ فرمایا ہے کہ مولانا آزاد نے جب اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تو انھوں نے بنگال کے انقلاب پسندوں سے رابطہ قایم کیا، جیسا کہ انھوں نے انڈیا ونس فری ڈم India Wins Freedom میں بھی لکھا ہے: اور انھیں [انقلاب پسندوں کو] جو غلط فہمی تھی مسلمانوں کے سیاسی رول کے بارے میں اسے رفع کرنے کی انھوں نے کوشش کی۔ اس کے بعد ضیا صاحب نے رائے یہ دی ہے کہ اسی طرح ہمیں آج مولانا آزاد کے نقش قدم پر چل کر ہندو احیا پرستوں کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جو انقلابی اور احیا پسند کا فرق ہے، اسے فاضل مقالہ نگار نے نظر انداز کر دیا ہے۔ انقلابیوں کو واقعی میں شکوک تھے۔ اس وقت جو انگریزوں کی پالیسی تھی، سر سید کے انکار کے نتیجے میں مسلمانوں کا جو سیاسی رول تھا، اس کی وجہ سے انقلابیوں کو واقعی غلط فہمیاں تھیں مسلمانوں کے بارے میں، جو مولانا آزاد نے دور کیں۔ آج کے جو احیا پسند ہیں انھیں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہے، جس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ ہمیں ان سے لڑنا ہے، کن ونس (Convince — ہم خیال) تو وہ ہو ہی نہیں سکتے۔

---

[1] ریاض الرحمن شروانی: علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ عربی میں استاد ہیں۔ جدید عربی کی تحصیل کے لئے کچھ عرصہ مصر میں رہے ہیں۔ مولانا آزاد کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، اور لکھا بھی ہے، ان میں ان کا خاص مقام ہے۔

ہمارے یہاں مسلمانوں میں بھی بعض ایسی جماعتیں ہیں جن کا ذہن بنیادی طور سے
ہندو احیاپرستوں کے ذہن کے قریب ہے۔ وہ بھی اسی طرح کی بات کہتے ہیں۔ وہ کہتے
ہیں کہ ہمیں جن سنگھ کو یا اور جو Extremist (انتہا پسند) ہندو جماعتیں ہیں۔
انھیں اپروچ — (Approach کرنا، قریب لانا) چاہیئے، انھیں ہم خیال بنانا
چاہیئے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال سے اس وقت اس ملک میں لڑائی
رہی ہے ترقی پسندی اور رجعت پرستی کے مابین۔ ترقی پسند طاقتوں کے ساتھ
مسلمانوں کی بھی بعض طاقتیں ہیں، ہندوؤں کی بھی بعض طاقتیں ہیں۔ اسی طرح سے رجعت
پرستوں کی طرف بھی ہندوؤں کی بھی بعض طاقتیں ہیں اور مسلمانوں کی بھی بعض طاقتیں؛
ایک فیصلہ کن جنگ ان دونوں طاقتوں میں ہونا ضروری ہے۔ اس وقت ان کو ہم خیال
بنانے یا لیپا پوتی کرنے سے کام چل جائے، یہ وقت گزر چکا ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ جو
ہماری پچھلی بیس برس کی سیاسی تاریخ ہے، اور جو لوگ ہمارے یہاں برسرِاقتدار
رہے ہیں، ہمارے ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگرس، اس کی بھی یہی کمزوری
رہی ہے کہ اس نے کوشش یہی کی کہ سب کو ساتھ لے کر چلیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ
سب کو ساتھ لے کر چلنے کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ ادھر کچھ عرصے میں مسلمانوں میں بھی اس
طرح کی کوششیں کی گئیں کہ ہر خیال کے مسلمان مل کر، متحد ہو کر، ایک جماعت بنا کر،
کام کریں۔ میرے خیال میں یہ تجربہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔ ابھی ڈاکٹر سید محمود صاحب کا
ایک انٹرویو ایک اردو رسالہ میں چھپا ہے۔ انھوں نے بھی اس بات کو مانا ہے کہ تجربہ
ناکام ہو چکا ہے۔ اور وہی اس تجربے کے اس وقت حامی تھے اور سب سے آگے آگے
تھے۔ تو میرا خیال ہے کہ یہ تجربہ کہ ہر طرح کی طاقتیں مل کر کام کریں، یہ نہیں ہو سکتا۔ اب
تو ایک فیصلہ کن جنگ ہونی ہے خیر و شر کی طاقتوں میں۔ شر کی طاقتوں میں بھی ہندو مسلمان
ہیں اور خیر کی طاقتوں میں بھی سب ہیں۔ اور جیسا ضیا صاحب نے بھی آگے چل کر اپنے

مقالے میں کہاہے کہ اصل جو اس وقت ہمارے مسایل ہیں ان کا حل یہی ہے کہ سیکولرازم کی، سوشلزم کی، پروگرس کی، ڈیماکریسی کی جو طاقتیں ہیں، ان کا ساتھ دینا چاہیئے ۔ خاص طور سے مسلمانوں کو۔ اس لئے کہ جو اس وقت ملک کے حالات ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ دراصل ان حالات کو کیمونل (Communal ۔ فرقہ وارانہ) رنگ دے دیا جاتاہے، جرمنی میں بھی یہودیوں کے خلاف جس طرح دراصل ایک فسطائی تحریک تھی، اسی طرح یہاں بھی کچھ ایلی منٹس (Elements ۔ عناصر) ہیں، یہ فسطائی ذہنیت کے لوگ ہیں، جو پہلا ٹارگٹ (Target ۔ نشانہ) مسلمانوں کو بنارہے ہیں، لیکن دراصل ان کا ٹارگٹ ملک کی ترقی، ملک کی خوش حالی، عوام کی ترقی ہے۔ سرمایہ دار جو باہر کی بعض طاقتوں کے ایجنٹ ہیں، یہ دراصل سب ان کا کھیل ہے ۔ اس کھیل کا نشانہ ہم بنتے ہیں، کیوں کہ ہم اقلیت میں ہیں۔

پھر میں اس سلسلے میں یہ بھی عرض کروں گا کہ یہ بات جو بیچ میں آئی ہے کہ مسلمانوں کا کیا رول رہا ہندستان کی جنگ آزادی میں ۔ تو اس میں بھی تھوڑی سی غلط فہمی ہے میرے نزدیک۔ ان کا کوئی ایک رول نہیں رہا ہے مسلسل۔ ایسے پی ریڈ (Period ۔ وقت) بھی آئے ہیں جب مسلمانوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ اور ایسے وقت بھی آئے ہیں، جن کی طرف ضیا صاحب نے اشارہ کیا اور مولانا کو کوٹ Quote کیا ہے [حوالہ دیا ہے] ، جب واقعی مسلمان جنگ آزادی سے کٹ گئے ہیں۔ انگریز نے حکومت مسلمانوں سے لے لی تھی۔ غدر جس کو کہا جاتاہے، ہماری پہلی جنگ آزادی تھی، اس میں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا رول سب سے نمایاں تھا۔ اس سے پہلے بھی ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کی سیاسی تحریکیں تھیں، جس میں مسلمان سب سے پیش پیش تھے۔ لیکن پھر ایک دور آیا، جسے کہہ لیجیے سر سید کی تعلیمات کا جب اثر مسلمانوں میں پھیلا، تو واقعی مسلمان جنگ آزادی میں پچھڑ گئے۔ اور وہی وقت تھا جب مولانا آزاد

نے وہ بات کہی تھی، جو ضیا صاحب نے کوٹ کی ہے۔ اور اس وقت مولانا محمد علی اور مولانا آزاد رحمت اللہ علیہ کی کوششوں سے پھر ایک وقت آیا کہ مسلمان جنگ آزادی میں شریک ہوئے، اور انھوں نے اس میں حصہ لیا، لیکن [۱]

ضیاء الحسن فاروقی (مقالہ نگار)

مجھے یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ میرے خواب، تعبیروں کی کثرت سے پریشان ہو گئے۔ علوی صاحب نے علیحدگی پسندی اور قرن اول کے سادہ مسلمانوں کی بات اٹھائی۔ ظاہر ہے مسلمانوں کو اس سے بڑی چڑ ہوتی ہے۔ میں مسلمانوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ آپ ایسے شخص کو بھی، جو قومیت اور اسلام کو دو متصادم اور متخالف فورسیز (Forces - قوتیں) سمجھتا ہے، یہ کہہ دیں کہ اس کا علیحدگی پسندی کا رجحان ہے تو وہ بہت ناراض ہوگا۔ میری مراد کسی کے اوپر الزام لگانا نہیں ہے، نہ یہ کہ سب مسلمان علیحدگی پسند ہیں۔ اگر آپ اس کنٹکسٹ (Context - سیاق و سباق) میں دیکھیں تو علیحدگی پسندی یعنی اپنے خول میں سمٹ جانا، اس کے جو عوامل ہیں، جو محرکات ہیں جو فورسیز ہوتی ہیں ان کا اثر پڑتا ہے، اور لامحالہ یہ نفسیات اور بھی پیدا ہو جاتی ہے، خاص طور پر ان ذہنوں میں جہاں یہ گتھیاں ہیں کہ اسلام اور قومیت میں ہم آہنگی نہیں ہو سکتی ہے وہاں پر یہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔

---

[۱] افسوس ہے کہ ٹیپ (Tape) بدلنے کی ضرورت پیش آنے کی وجہ سے ریاض شروانی صاحب کے آخری جملے ری کارڈ نہیں ہو سکے۔

اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اچھی زندگی وہی ہے جس کی اچھی طرح سے جانچ کرلی جا
اور اچھا خیال وہی ہے، جس کو اچھی طرح سے پرکھ لیا جائے اور عمل کیا جائے، اور و
زندگی رہنے کے قابل ہے اور وہی خیال عمل کرنے کے قابل۔ تو مسلمانوں کو سلف
کرٹیسزم (Self-criticism — خود تنقیدی) کرنا چاہیے، اپنی تنقی
کرنی چاہیے، جبھی مسلمانوں کو صحیح منزل نظر آئے گی۔ میں خود اپنی ذہنیت کو بتاتا ہو
کبھی کبھی آج کے حالات میں مجھ پر خود اتنی مایوسی طاری ہو جاتی ہے کہ محسوس کرنے لگ
ہوں کہ سب بیکار ہے۔ جو اس وقت ملک کے حالات ہیں اور مسلم اقلیت پر جو گز
ہے فوراً ہی محسوس ہوتا ہے کہ سب بیکار ہے کچھ بھی کرنا بیکار ہے۔ کاہے کے لئے مکان بنو
کاہے کے لئے تعلیم دلائیں بچے کو۔ کاہے کے لئے یہ سب کریں۔ فوراً ذہن میں یہ بات آ
ہے۔ یہ بالکل نیچرل ری ایکشن (Natural reaction — قدرتی رد عم
ہے، لیکن ایک تو یہ ہے کہ میں اس ری ایکشن پر پرسسٹ (Persist — اص
کروں، اصرار کروں کہ نہیں یہ رہے گا، اور اب تو یہی ہوگا، اور تمام یقین اور ارادہ کو
اور اس دولت سے محروم ہو جاؤں جس سے زندگی کو تقویت ملتی ہے۔ تو میں سمجھتا ہو
میری زندگی ختم ہوگئی۔ جب ایک فرد کا یہ حال ہے تو چار پانچ کروڑ مسلمانوں کی جو جماعت
اس کا بھی یہی حال ہو سکتا ہے۔ اس لئے بار بار یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ ذرا بھی وس
اگر پیدا ہو، خیالات کا کتنا ہی سخت دباؤ، کہ آئی سولیشن (Isolation) میں جا
ہے یا اپنے خول میں سکڑ جاتا ہے تو فوراً یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلام کی تعلیم کیا کہتی ہے، وسع
نظر کا کیا مطالبہ ہے۔ میں نے علیحدگی پسندی کا لفظ سمجھ بوجھ کے استعمال کیا تھا میر
مقصد مسلمانوں کو چڑانا نہیں تھا کہ ان کے اندر یہ رجحان ہے جیسا کہ ہمارے بہت
قومی لیڈر کہتے ہیں کہ مین اسٹریم (Mainstream — قومی دھارے)۔
الگ ہو گئے ہیں۔ یہ مقصد یہاں نہیں ہے۔ اگر پورے کنٹکسٹ میں دیکھیں تو آ

کے حالات میں مسلمان جو پارٹ پلے (Play - ادا) کر سکتا ہے اس کنٹکسٹ میں علٰحدگی پسندی مفہوم ہے۔

اب قرن اول کے سادہ مسلمانوں کی بات لیجئے۔ قرن اول کے سادہ مسلمانوں سے اسلام کی سادہ تعلیم مراد ہے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے، میں اس میں نہیں پڑوں گا کہ عہدِ وسطیٰ کے جو انٹرپریٹیشن (Interpretation - تعبیر و تشریح) ہیں اسلام کی، جو خاص حالات میں کئے گئے، اور جس کے اوپر ایک وقت آیا کہ تمام فکر و نظر کے اور اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اور یہ سمجھ لیا گیا کہ اب حالات نہیں بدل سکتے" اور تغیر اللہ کی سنت نہیں ہے قرآن نہیں مانتا ہے۔ حالانکہ روزمرہ ہم دیکھتے ہیں، قرآن بھی پکار پکار کر کہتا ہے اور خود ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ زندگی میں ترقی ہوتی ہے۔ پودوں کی زندگی ہو، آدمیوں کی زندگی ہو، کسی کی ہو، تو تغیر سے مراد یہاں اس کنٹکسٹ میں یہ ہے کہ صدیاں پھلانگنی ہوں گی آپ کو اس سادہ تعلیم تک پہنچنے کے لئے۔ جو فقہی موشگافیوں میں الجھ کر کے کچھ کا کچھ ہو گئی ہیں۔ مولانا نے جب یہ کہا تھا تو یہی بات کہی تھی۔ اس کے لئے تقلید کی، اوہام کی، توہمات کی، خیالات کی، جو اس زمانے کے ہیں ـــــ سب کی زنجیریں توڑنی ہوں گی۔ یہ بڑی ہمت کا کام ہے میری مراد اس سے یہی تھی۔ میری مراد اس سے یہ نہیں تھی کہ جنت اور دوزخ۔ جنت و دوزخ تو ہم اس دنیا میں بناتے ہیں اپنی۔ مولانا کا ایمان ہو یا نہیں، مجھے یہ نہیں معلوم۔ لیکن میرا ایمان یہ ہے کہ جنت اسی دنیا میں ہو سکتی ہے، اسے ہم فلسفیانہ زبان میں اسپریچول بلس Spiritual Bliss - روحانی مسرت) کہہ سکتے ہیں جو نیک کام کرنے کے فوراً بعد دل کے اندر مسرت کی لہر دوڑتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، وہ جنت ہے۔ اور جہنم کا نام آپ روحانی کرب اور اسپریچول جو آپ کو تکلیف ہوئی ہے اس کو قرار دے سکتے ہیں۔ اس کی تعبیریں تو بہت ہو سکتی ہیں۔

اور کس طریقہ سے آپ یقین کی یہ دولت حاصل کر سکتے ہیں، میرے پاس کوئی نسخہ نہیں ہے۔ کیونکہ یقین کی دولت کا معاملہ دل سے ہوا، اور دلوں کو بدلنے کے لئے میرے پاس کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے، پریس کرائبڈ (Prescribed لکھا ہوا) کہ میں یہ کہہ دوں کہ آپ اس کو پی لیجئے آپ کی دل کی دنیا بدل جائے گی [ایک آواز: ابوالکلام کی زبان بول رہے ہیں اس وقت' آپ !]۔

مالک رام صاحب نے بہت اچھا کیا کہ وحدتِ ادیان کے نقطۂ نظر کو واضح کر دیا۔ میری کوئی اس سے بحث نہیں ہے۔ میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں جیسا کہ قرآن بھی، کہ سچائی ایک ہے، مذاہب اپنے اپنے طور طریقے سے اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کو اگر ہم سب لوگ مان لیں تو مذہب کے نام پر جو نزاعات ہیں وہ ختم ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے۔ لیکن ہوتا کیا ہے، کہ خود مسلمانوں میں جتنے فرقے ہیں ایک دوسرے کے خلاف کہتے ہیں کہ وہ غلط راستے پر ہے اور وہ کبھی سچائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو جب مسلمانوں کے اپنے ہی فرقوں کا یہ حال ہے تو دوسروں کے مقابلے میں کیا حال ہوگا۔

علوی صاحب نے جو پوائنٹ اٹھایا ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو نہیں سمجھا، انھوں نے غالباً میرا وہ فقرہ چھوڑ دیا جہاں میں نے کہا ہے کہ خالص ذہنی سطح پر مسلمانوں نے ہندو دھرم کو سمجھنے کی، اور ہندوؤں نے مسلمان دھرم — اسلام — کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ [ایک آواز: بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے] ہاں۔ اور میں نے کہا ہے کہ بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ تصوف کے ذریعہ یا بھگتی' موومنٹ Movement — تحریک کے ذریعہ سے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب آئے، لیکن کیا وجہ ہے کہ جب فائنل مومنٹ آف ڈیسیشن (Final moment of decision آخری فیصلہ کن لمحہ) آیا، تو ایک دوسرے سے الگ نظر آئے۔ یہ ایک بنیادی چیز ہے، اور ایک

ہسٹاریکل (Historical) تاریخی چیز ہے۔ آپ اس پورے عہد وسطیٰ کا اسلامک لٹریچر پڑھ جائیے، آپ کو یہ فرق ملے گا کہ ایک فرقہ اپنے آپ کو ناجی سمجھتا ہے دوسرے کو کافر، پھر اور بہت سی چیزیں ہیں۔ ابھی حال میں میرے ایک طالب علم نے مجھ سے کہا کہ "محرم آپ کو مبارک ہو" بی۔ اے۔ کا طالب علم ہے وہ، اور مجھے یہ مبارک باد دے رہا تھا۔ اس طرح کے بہت سے لوگ مل جائیں گے۔ خاص طور سے میں نے ایمفیسس (Emphasis) دیا ہے (زور دیا ہے) آج کی نسل میں جس طرح کی تعلیم ہوئی ہے اس کو، جس سے وہ ایک دوسرے سے قطعی ناآشنا ہیں۔ ہم میں یہاں کتنے لوگ بیٹھے ہیں جنھوں نے ہندو دھرم کا بہت اچھا مطالعہ کیا ہے؟ بہت کم لوگ ہوں گے!

قاضی صاحب (سجاد حسین صاحب) تو چلے گئے۔ میں نے دراصل جو بحث اٹھائی نہیں تھی کہ مسلمانوں نے آزادی کی لڑائی میں حصہ نہیں لیا [ایک آواز: وہ جواب کو ہو گیا کوثر صاحب کی طرف سے]۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مشترک کوشش آزادی کی جو ہوئی، مسلمانوں نے اپنے طور پر جو کچھ بھی کیا ہے لیکن جو مشترک کوشش ہوئی، میری مراد اس سے تھی۔

ریاض صاحب نے جو کہا ہے تو یہ بالکل میں ان سے اتفاق کرتا ہوں کہ اس وقت رائٹسٹ مومنٹس (Right ist movement) ہیں ہندستان میں۔ ان سے یہ امید کرنا کہ مسلمانوں کو سمجھ بوجھ کر قریب لائیں مشکل ہے لیکن اپیل کرنے میں کیا حرج ہے۔ مسلمانوں کو بہر حال میں نے جو دعوت دی ہے، پازیٹو (Positive) وہ یہی ہے کہ ان کو ترقی پسند عناصر کے ساتھ مل کر کے جنگ کرنی چاہیے۔

ارونا آصف علی

میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ ہماری چھوٹی سی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا، ہماری کمیٹی عارضی تھی، کوئی مستقل کمیٹی نہ تھی، کہ مولانا کی دسویں برسی پر ہم کچھ سوچیں گے۔ گہرائی کے ساتھ ان کی تمام زندگی پر روشنی ڈلوائیں گے ایسی شخصیتوں سے جن کو فرصت ملتی ہے سوچنے سمجھنے کی اور پڑھنے لکھنے کی۔ یہ سمینار اور زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا، اور ہمارے جو لوگ نہیں آسکے ہیں، وہ بھی آسکتے تھے۔ یہ ہماری کم زوری تھی کہ ہم نے اس چھوٹے سے پیمانے پر اس چیز کو رکھا۔ آج یہاں آنے کے بعد نورالدین صاحب اور ہم یہی باتیں کر رہے تھے۔ اور فاروقی صاحب کا فاضلانہ پیپر (Paper — مقالہ) سن کر اس کا احساس اور زیادہ ہو گیا، جس میں انھوں نے مولانا کی زندگی اور ان کے اصولوں کی ہلکی سی جھلک دکھلائی ہے۔ اس سے سب ہی کو، کم از کم مجھے تو، بڑا فایدہ ہوا۔ میں آدھے گھنٹے کے لیے آئی تھی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کہا: میں سارا سن کر ہی جاؤں گی۔

افسوس اسی کا رہا کہ اتنی کم تعداد میں ہم یہاں اکٹھا ہوئے، اور بہت سے ہمارے ایسے ساتھی کہ جن کو سننا چاہیے تھا، جو اس وقت بہت پریشان ہیں، جیسا کہ آپ سب نے کہا، بہت مایوس ہیں آج کل کے حالات سے، اگر وہ یہاں موجود ہوتے تو انھیں بھی بڑا فایدہ ہوتا۔ میں یہی امید کرتی ہوں کہ یہ کام ہم چالو رکھیں گے، جس خیال کے ساتھ ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں، آگے چل کر ہم اس تحریک کو جاری رکھیں گے تاکہ اور روشنی پڑے [نورالدین: نومبر میں جو سمینار ہوگا وہ اور بڑے پیمانے پر ہوگا]۔ ہاں تو نومبر میں اسی کی کوشش ہوگی، جیسا کہ نورالدین صاحب نے کہا ابھی۔ [نورالدین: یہ سمینار مولانا کے ۸۰ ویں یوم پیدائش کے موقع پر ہوگا]۔

مولانا کو دیکھنے کا مجھے بھی موقع ملا ہے تیس سال تک، اسی عرصے میں جس کا

آپ نے ابھی ابھی ذکر سنا ہے۔ سن ۳۶ء سے نہیں، ۳۰ء سے پہلے ۳۲ سے لے لیجئے۔ بلکہ سن ۳۰ء سے لے کر ان کے انتقال کے وقت تک کافی نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مگر بعض دفعہ ہوتا ہے کہ جب آپ ایک بڑی شخصیت کے بہت نزدیک ہوں، قریب ہوں تو ان کی کچھ خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ اور مجھ جیسے شخص کے لئے تو بہت پریشانی ہوا کرتی تھی۔ کیوں کہ ہم ڈرتے تھے بہت مولانا سے۔ وہ اتنے فاضل اور عالم تھے ہم نہ اردو جانتے تھے، اور نہ انگریزی جانتے تھے، کچھ عجیب سی ہم لوگوں کی کیفیت تھی مگر دھیرے دھیرے وہ ہمارا ڈر دور ہوا۔

ہاں جو بات کہنا چاہ رہی تھی میں آپ لوگوں سے، وہ یہ ہے، کہ ان میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ بڑی ماڈرن (Modern — جدید) طبیعت کے تھے۔ ڈر ہم کو یہ تھا کہ وہ کہیں گے کہ صاحب! یہ تو پردہ نہیں کرتی ہیں خیال تھا کہ مولانا ہیں، بڑے فاضل ہیں، نہ معلوم ہمارے بارے میں کیا رائے ہوگی ان کی۔ ہماری تحریک اور ہمارے خیالات سے، اور زندگی میں جو کچھ ہم سوچ رہے تھے، ان سب باتوں میں ان سے ہم سے اتفاق ہو گیا نہیں۔ مگر دھیرے دھیرے ہم نے دیکھا کہ ان کا دماغ بہت تیز، بہت آگے جا پہنچا۔ وہ انیسویں صدی کا دماغ تھا، لیکن وہ بیسوی صدی کے انسان کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ ایک چیز یہ بھی میں نے محسوس کی کہ ان کے سامنے ایمان دارانہ طور پر کوئی اپنی رائے رکھے، چاہے وہ کتنی ہی ایتھی ایسٹک (Atheistic) کیوں نہ ہو۔ یعنی مذہب کے خلاف کیوں نہ ہو، مگر ان کو اگر یہ معلوم ہو کہ اس میں بھی ایک اصول کام کر رہا ہے، اور اس لئے مذہب کی مخالفت نہیں ہے کہ اس کے بہانے کوئی بے کار زندگی بسر کرنے کی خواہش یا بے اصولا پن نہیں ہے اس میں [تو وہ اسے سنتے تھے]۔ ہم اگر ان سے یہ کہتے کہ مارکسزم (Marxism) ہمیں یہ بتاتا ہے، اب اس کی دلیل آپ دیکھئے۔ اپنی دلیل سے آپ ہسٹاریکل میٹیریلزم (Historical Materialism)

۔ تاریخی مادیت کی تردید کیجیے۔ ہم ان سے بحث کرتے تھے، اور وہ ہمارے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتے تھے اپنے طرز سے، اور بتاتے تھے، نہیں، اس میں یہ غلطی ہے' اور اس میں یہاں تک سچائی لگی ہے۔ آپ کو اس کا حق ہے، اور ہر انسان کو اس کا پورا حق ہے' اگر کوئی یقین رکھتا ہو تو اپنے یقین کی بنا پر اپنی زندگی کو ڈھالے۔

کوئی فنا ٹی سزم (Fanaticism)۔ کیا کہتے ہیں اسے اردو میں [ایک آواز، کٹر پن]۔ ہاں تو کوئی کٹر پن میں نے کبھی نہیں پایا مولانا میں، بالکل نہیں پایا۔ وہ کٹر پن جو آج ہندستان میں ہے، وہ کٹر پن جو ہر مذہب کے بڑے بڑے عالم فاضل لوگوں میں پایا جاتا ہے۔

Relevance of Maulana Azad to present-day India

کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ Relevance کا جو ہم نے یہ لفظ استعمال کیا ہے [اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ] آج کی زندگی کو، ہندستان کی زندگی کو خاص طور پر مولانا کے اصولوں سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے، یا ہم اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس سے کیا سبق لے سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ وہ ایک ہی سبق ہے، اور وہ ہے نڈرتا۔ بنا ڈر کے اپنے اصول کے لیے، یا جس چیز کو ہم حق سمجھتے ہیں یا صحیح سمجھتے ہیں، اس چیز کے لیے جد و جہد کرنا۔

آج کے زمانے میں، جیسا کہ ابھی ایک صاحب [ریاض الرحمٰن شروانی] نے فرمایا، بالکل صحیح ہے کہ اسٹرگل (Struggle کشمکش) ہے پروگریسو Progressive ترقی پسند) اور ری ایکشنری (Reactionary ۔ رجعت پسند) قوتوں میں اور یہ ہمیشہ ہی سے رہی ہے۔ ہمارے نظریے کے مطابق تو پوری ہسٹری، پوری تاریخ ہی یہ ہے۔ اور یہی صورت آج بھی ہے۔ یہ لڑائی سب کو مل کر لڑنی ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں، ہندو ہوں، عیسائی ہوں یا سکھ ہوں — خاص کر مسلمانوں کو۔ اس اصول کو

اگر وہ اپنا لیتے ہیں کہ ہمیں تشدد اور ظلم کے خلاف لڑنا ہے۔ ا کس پلائی ٹیشن
Exr olitation کا لفظ انگریزی کا ہے ــ ہر قسم کا ظلم و ناانصافی ۔۔ اس کے خلاف
لڑنا ہے، چاہے وہ اپنے ملک میں ہو، چاہے باہر کے کسی ملک میں۔

بعض دفعہ غلط فہمی ہو جاتی ہے مسلمانوں کے بارے میں۔ ان کا ایک سکشن
(Section) ایک مذہبی نظریہ رکھتا ہے۔ مثال کے لئے دیکھئے کہ جب عرب ملکوں پر
اسرائیل کا حملہ ہوا، اور ہم لوگوں نے تھوڑی بہت کوشش کی کہ یہ ایک ایگریشن
(سامراجی حملہ) ہے اور اس کی مخالفت ہونی چاہئے۔ ہمیں بڑی خوشی
ہوئی کہ دلی کے مسلمان طبقے میں ــ میں تو دلی کا ذکر کر رہی ہوں، بہت جوش آیا، اور
ہمیں بھی اس سے طاقت ملی، اور ہم نے کافی جلسے وغیرہ کئے، مگر جب ویٹ نام کا معاملہ
آیا تو مسلمان کہیں آتے نہیں۔ حالانکہ دس سال سے بلکہ بیس سال سے ویٹ نام کا چھوٹا
سلک ــ آپ اور ہم تو سب جانتے ہیں کہ کس بہادری کے ساتھ، کس خوب صورتی کے
ساتھ، کس دلیری کے ساتھ لڑ رہا ہے، اور امریکا کو کس طرح شکست پر شکست دیتے
جا رہے ہیں۔ ویٹ نام کے مسئلے میں صرف مسلمان ہی نہیں، یہاں تو اور بھی طبقے ایسے
ہیں جو اس کے لئے آگے نہیں بڑھے۔ [نورالدین: مسلمان تو حصہ ہی نہیں لے رہے ہیں
مگر اور طبقے تو طرف داری کر رہے ہیں امریکا کی! (قہقہہ)]۔ مطلب یہ ہے کہ نیشنل اسٹرگل
(National Struggle ــ قومی جد و جہد)، قوم پرستی یا نیشنلزم کا
جو سبق دیا مولانا نے ہم سب کو، اس میں یہ بات تھی کہ ظلم [کے خلاف جنگ کی جائے]
اس وقت ظالم انگریز تھے، اس وقت جو بھی ہو [اس کے خلاف ہمیں لڑنا چاہئے]
مگر بد قسمتی ہے، جسے ہم ظالم کہتے ہیں دوسرے اسے ظالم کہتے ہی نہیں۔ یہ ظالم نہیں
ہے تو یہ ٹکراؤ کیوں ہے۔ اس ٹکراؤ کو ختم کرنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہئے
ہمیں ڈرنا نہیں چاہئے کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو جب ہمیں ووٹ نہیں ملیں گے۔ نہیں

ملیں گے، نہ ملیں۔ ہم تو اپنے اصولوں کے قایل ہیں۔ ووٹ کی خاطر لڑنا تو دنیا کو یہ بتلانا ہے کہ نہیں صاحب ہم تو ڈر گئے، کیوں کہ آپ ہمیں ووٹ نہیں دیں گے۔ ووٹ کے چکر میں بہت سے لوگ ہیں۔

اور دوسری چیز ہے لالچ۔ جس سے کہو کہ لڑنا ہے، اس بات پر ڈٹنا ہے، وہ کہے گا، نہیں صاحب! ہمیں تو فلاں چیز کی ضرورت ہے، ہمیں فلاں چیز چاہیے۔ کوئی کہے گا ہمیں ممبر بننا ہے، ہمیں وزیر بننا ہے۔ نہ معلوم لوگوں کو کیا کیا بننا ہے، جو بات میں اس وقت کہہ رہی ہوں وہ صرف ہندوؤں ہی کی نہیں ہے۔ یہاں تو سب ہم سب اسی چکر میں پھنسے ہیں ــــ ہندو ہوں یا مسلم۔ اس وقت ہر شخص اصول کو بھول رہا ہے، جس کو ہم لوگ کہتے ہیں Opportunism موقع پرستی ہم سب اسی میں مبتلا ہیں۔ کیوں کہ ایک ڈر بیٹھ گیا ہے کہ اگر ہم نے کچھ زیادہ کہا تو کسی نہ کسی طرح ہماری زندگی پر اس کا اثر پڑے گا۔ بہر کیف میرا کہنا تو یہی ہے کہ ہمیں اپنے اصولوں کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔

عتیق صدیقی

اس برصغیر کو لیلائے آزادی سے ہم کنار کرنے اور آزاد ہندستان کی تعمیر نو میں مولانا آزاد نے نمایاں حصہ لیا۔ ان کارناموں میں ان کی حیثیت شریک غالب ہی کی نہیں، بلکہ امام کی تھی۔ وہ حقیقی معنوں میں امام الہند تھے۔ تقسیم سے قبل، اور تقسیم کے بعد بھی، ہماری سیاسی ناؤ جب بھی کسی خطرناک منجدھار میں پھنسی مولانا آزاد نے آگے بڑھ کر مردانہ وار اس کی کھیون ہاری کی اور اُسے کنارے لگایا۔ ہماری گزشتہ نصف صدی کی تاریخ کی کتنی ہی یادیں ان کی ذات سے وابستہ ہیں۔ لیکن آج ان کے نام میں ہمارے لئے کتنی کشش و جاذبیت باقی رہی ہے؟ یہ ایک المیہ اور افسوسناک المیہ ہے کہ اس دیو پیکر شخصیت کے افکار کے ساتھ ذہنی ربط و وابستگی محدود ہے اس نسل کے ایک چھوٹے سے گروہ تک جو خود مولانا ابوالکلام آزاد کی نسل تھی، یا جس نے ہماری جد و جہد آزادی کا وہ دورِ عروج دیکھا تھا جو مولانا آزاد کے حسن و شباب کی طرح ان کی اور ان کے افکار کی مقبولیت کا بھی دورِ عروج تھا، جب ہر گھر میں ان کی پوجا ہوتی تھی۔ جب ہر شخص 'بلا تفریق مذہب و ملت' ان کے نام کی مالا جپتا تھا۔ ہماری نئی نسل نے تو مولانا آزاد کو دیکھا ہی نہیں، اور جنھوں نے دیکھا بھی انھوں نے اس ابوالکلام کو دیکھا جو ایک ایسا کوہ آتش فشاں تھا، جس نے گرم لاوا اگلنا بند کر دیا تھا، لیکن اس کی راکھ میں چنگاریاں نہیں، بلکہ دہکتے انگارے چھپے تھے، جو آج ان کے مرنے کے دس سال بعد بھی بجھے نہیں ہیں۔ مگر اس راکھ کو کریدنے کی ہمت آج ہم میں سے کسی میں بھی نہیں ہے۔

عابد رضا بیدار نے اپنی تازہ ترین تصنیف "ابوالکلام آزاد" میں یہ بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ "ہندستانی مسلمان جس تہذیبی بحران سے دوچار ہوئے اور جس کے نتیجے میں ان گنت لاینحل مسائل پیدا ہوتے چلے گئے، شاید مولانا آزاد کے افکار کی روشنی میں انھیں زیادہ بہتر طور پر سلجھایا جا سکتا تھا اور وہ وقت اب بھی نہیں گیا ہے۔" ڈاکٹر بیدار کے اس خیال میں بڑی جان ہے۔

سیرو دیوا[۵۰]

۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندستانی مسلمانوں کے افکار میں، انکے مذہبی، مابعد الطبیعاتی، سماجی، اور سیاسی نظریوں میں متعدد رجحانات ملتے ہیں، تاہم بہ کثرت جلوہ آخر کار سیاسی میدان میں دو رجحانوں میں اپنے آپکو سمیٹ لیتی ہے: ایک فرقہ پرور تحریک جسکے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا، دوسرے ہندو مسلم اتحاد کی تحریک، اور تحریک حریت کے آخری مرحلہ میں دو رجحان دو افراد کی صورت میں متشکل ہو گئے تھے مسٹر جناح اور مولانا آزاد۔

دوسری طرف ہندستانی مسلمانوں کے جو دو اہم مابعد الطبیعاتی رجحانات مذہبی جدیدیت اور احیاء پرستی کے تھے، انکو بھی اگر ہم دو ممتاز افراد کے ساتھ مشخص کریں تو اول الذکر کے نمائندے اقبال ٹھہرتے ہیں اور ثانی الذکر کے مولانا آزاد۔ یہاں یہ بات مد نظر رکھنی ضروری ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی جدیدیت اور احیاء پرستی کے یہ دونوں رجحانات قطعی طور پر الگ الگ ممیز، متعین اور واضح نہیں ہیں، اس تقسیم کو ہم زیادہ سے زیادہ نسبتی یا عمومی قسم کی تقسیم کا درجہ دے سکتے ہیں، ہر دو رجحانات میں نہ صرف یہ کہ مختلف نظریات کے آمیزے شامل ہیں بلکہ ایسے بھی جن سے آمیزہ کے عملاً بالکل متضاد قسم کے نتائج رونما ہوئے۔ مثلاً جماعت اسلامی، ازمنہ وسطیٰ کے معاشی و سماجی نظم کو واپس لانا چاہتی تھی۔ دوسری طرف مولانا تھے جو احیاء پرستی میں بھی اسلام کے جمہوری پہلو کو زیادہ اجاگر کرتے تھے اور اس طرح اُسے اپنے زمانے کے سیاسی حالات پر منطبق کرنا چاہتے تھے۔ اور انکے اکثر ہم وطنوں کی مانند آزاد مذہبی عقائد کو نہ صرف ہر فرد کیلئے ضروری سمجھتے تھے بلکہ پورے سماج کی زندگی کیلئے ناگزیر۔ انکے بقول فلسفہ اور سائنس سے حقائق کا علم ملتا ہے لیکن وہ روحی ایقان اور اندرونی ذہنی سکون تو نہیں دے سکتے۔ مذہب ہمیں اخلاقی قدروں پر ایمان عطا کرتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جسکی روشنی صرف مذہب ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچ سکتی ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے سلیقہ کے ساتھ ادا کرنا ہے وہ ایک فرض، ذمہ داری ہے جسے بہر حال اُٹھانا ہے۔ (غبار خاطر)

قومی تحریک کی جد و جہد میں شامل ہونے کے بعد مولانا آزاد نے مذہب سے مابعد الطبیعاتی مسائل ہی میں نہیں، سامنے کے سیاسی مسائل میں بھی رہنمائی طلب کی۔ قرآن مجید کی جو مروجہ روایتی تفسیریں تھیں وہ ان کے خیال میں جامد افکار کی حامل تھیں

---

۵۰ ڈاکٹر مسز اشتینسٹ سیرودیوا سوویت سفارتخانہ کے ثقافتی حصہ سے منسلک فلسفی خاتون جنھوں نے ہند و پاک کے برصغیر کے عہد جدید کے مفکروں پر تحقیقی کام کیا ہے اور متعدد کتابیں روسی زبان میں لکھ چکی ہیں، یہ مقالہ بھی آزاد تقریب میں انگریزی میں پڑھا گیا۔

ور سماجی ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بنا! انھوں نے عصرِ جدید کی روشنی میں قرآن کی تفسیر
کوشش کی۔ لیکن یہ انھوں نے اسلامی عقائد کو جدید بنا کے نہیں کیا بلکہ اسلام کی
صل تعلیمات کا احیاء کر کے۔ ان کا طریقِ تفسیر یہ تھا کہ "قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے
فظوں میں تلاش کریں"[1] انھوں نے کوشش کی کہ قرآن کو اس طرح پڑھیں اور سمجھیں
س طرح عہدِ نبوی کے مسلمانوں میں وہ پڑھا اور سمجھا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں
اس امر کا بطورِ خاص لحاظ رکھا کہ سلف کی وہ پہلی نسل جس کے سامنے قرآن پہلی
پڑھا گیا، ان کی طبیعتیں وضعی طریقوں میں نہیں ڈھلی تھیں۔ اس لئے وہ قرآن کی سیدھی
ادی حقیقت بے ساختہ پہچان لیتے تھے[2]۔ "قرآن کے افکار مولانا کے خیال میں
ل سادہ ہیں۔

اپنے طریقِ تفسیر کو پیشِ نظر رکھ کر انھوں نے لفظ اللہ کی اصل کی اس طرح وضاحت کی:

"خالقِ کائنات کے لئے یہ لفظ اس لئے اسم قرار پایا کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا
رجان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے"[3]۔

ولانا نے خدا کے وجود کی منطقی دلیلیں دینے کی کوشش نہیں کی، ان کا کہنا تو یہ تھا کہ یہ
کہ انسان خدا کے بارے میں شک کرے یا اس کے وجود کا انکار کرے، بالکل غیر
ی ہے۔ کیونکہ خدا کے وجود کا احساس انسانی سرشت میں موجود ہے۔ خدا کی موجودگی
ق سے آغاز کر کے وہ خدا کی صفات کا تجزیہ کرتے ہیں جن کے سمجھنے میں، ان کے خیال
مطابق، انسان اکثر غلطی کرتا ہے۔ مولانا کے نزدیک جس طرح خدا کے وجود پر اعتقاد
دہ انسان کی فطرت میں ہے، اسی طرح یہ بھی اس کے لئے ایک فطری امر ہے کہ خدا کی

---

[1] ترجمان القرآن مقدمہ ۳۲ [2] ایضاً: ۲۲ [3] ترجمان القرآن
ج ۱: ص: ۱۸

صفات کو انسانی جامہ دے۔ وہ لکھتے ہیں:

"انسان کی عقل ذاتِ مطلق کے تصور سے عاجز ہے۔ وہ جب کسی چیز کا تصور کرنا چاہتی ہے تو گو تصوّر ذات کا کرنا چاہیے، لیکن تصور میں صفات و عوارض ہی آتے ہیں، اور صفات ہی کے جمع و تفرقہ سے وہ ہر چیز کا تصوّر آراستہ کرتی ہے۔ پس جب فطرت کے اندرونی جذبے نے ایک بالاتر ہستی کے اعتراف کا ولولہ پیدا کیا تو ذہن نے چاہا اس کا تصوّر آراستہ کرے۔ لیکن جب تصوّر کیا تو یہ اس کی ذات کا تصور نہ تھا، اس کی صفات کا تصوّر تھا، اور صفات میں بھی انہیں صفات کا جنکا ذہنِ انسانی تخیل کر سکتا تھا۔ یہیں سے خدا پرستی کے جذبے میں ذہن و فکر کی مداخلت شروع ہو گئی ...... اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی ذہنِ انسانی نے خدا کی صورت بنانی چاہی، تو ہمیشہ ویسی ہی بنائی جیسی صورت خود اس نے اور اس کے احوال و ظروف نے پیدا کر لی تھی۔ جوں جوں اس کا معیارِ فکر بدلتا گیا وہ اپنے معبود کی شکل و شباہت بھی بدلتا گیا۔ اسے اپنے آئینۂ تفکر میں ایک صورت نظر آتی تھی، وہ سمجھتا تھا یہ اس کے معبود کی صورت ہے، حالانکہ وہ اس کے معبود کی صورت نہ تھی، خود اسی کے ذہن و صفات عکس تھا۔"[1]

مولانا کے خیال میں اپنشدوں کے تنزیہی وحدت الوجودی تصور میں، جو بالآخر صفت کا انکار کر دیتی ہے، اور صورت پرستی (اوتاریت) میں — قرآن درمیانی راستہ دکھاتا

---

[1] ترجمان القرآن ج ۱ متن: ص ۲۵

ے۔ اسلام کے اس رجحان کی جانب کہ وہ اوتاریت کے خلاف ہے مولانا بجا طور
وضاحت کرتے ہیں، لیکن یہاں اُن سے دو سہو بھی ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ ان کا یہ
خیال کہ پہلی بار اسلام نے اوتاریت کو ختم کرنا چاہا اس لئے غلط ہے کہ اسلام سے
بت پہلے، اولین بار یہودیت نے یہ کوشش کی تھی۔ دوسرے یہ کہ نہ اسلام ہی
ے پوری طرح ختم کرنے میں کامیاب ہو سکا نہ یہودیت! اس ناکامی کا اس امر
بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خدا دونوں کی کتابوں میں بالکل انسانوں کی طرح
نتا اور عمل کرتا ہے!

مولانا نے خدا کی صفات کی جو تشریح کی[1] وہ ان کے سارے تصورِ ربوبیت
بنیاد بنی۔ چار صفتیں انھوں نے اصل قرار دیں جو پہلی سورہ الحمد میں موجود
ہیں: رب العالمین، الرحمن، الرحیم اور مالک یوم الدین۔ لیکن اس تشریح
سے جو عمرانیاتی نتائج سامنے آتے ہیں وہ کسی قدر متضاد سے ہیں۔ ایک طرف ان کے
خیال میں کائنات میں ہم آہنگی اور تسویہ ہے، جو خدا کی رحمت و ربوبیت کا اظہار ہے
۔۔ اس سے انسان اس حسین و ہم آہنگ کائنات میں ایک انفعالی وجود کے رہ
کٹ کے رہ جاتا ہے؛ اور اس طرح اس دنیا کی تنظیم نو کے لئے کوئی بھی انسانی کوشش
عنی اور فضول محض ہو کے رہ جاتی ہے۔ دوسری جانب خدائی انصاف کے
نے کے بعد جو انسانی اعمال کے بدلے میں انعام یا سرزنش دونوں سے کام لے گا،
لانا انسان کو اپنے اعمال کے لئے ذمہ دار قرار دیدیتے ہیں ـــــ اور اس طرح
سان کے اختیار و ارادہ کے قائل نظر آتے ہیں۔

---

[1] ترجمان القرآن: ۱۲

آزاد کا نظریۂ علم ان کے ناگزیر تصورِ الوہیت ہی سے پیدا ہوتا ہے جہاں خدا انسانی علم کے ارتقا میں رہنما قوت ہے۔ خدائی ہدایت کا اظہار وجدان، احساس اور پھر عقل کے ذریعہ سے علم کی صلاحیتوں کی بخشش میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب سے برتر ذریعۂ علم بھی ناقص رہ جاتا ہے کیونکہ مولانا کے بقول "عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اور اعمال کی درستگی و انضباط کے لئے کافی نہیں.... جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے نہ ہر حال میں موثر"[۱]

تو "اگر اس نے وجدان کے ساتھ حواس بھی دیئے تاکہ وجدان کی لغزشوں میں نگرانی کریں، اور اگر حواس کے ساتھ عقل بھی دی تاکہ حواس کی غلطیوں میں قاضی و حکم ہو تو کیا ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دیتا تاکہ عقل کی درماندگیوں میں رہنما اور فیصلہ کن ہوتا۔ قرآن کہتا ہے کہ ضروری تھا، اور اسی لئے اللہ کی ربوبیت نے انسان کے لئے ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا سامان بھی کر دیا۔ یہی مرتبۂ ہدایت ہے جسے وہ وحی و نبوت کی ہدایت سے تعبیر کرتا ہے"[۲] (الھدیٰ)، یا بالفاظ دیگر مذہب یا دین! اور یہ وحی یا مذہب مولانا کے نزدیک کسی ایک گروہ کے لئے مخصوص نہیں تھا بلکہ پوری نسل انسانی کے لیے تھا، بلا امتیاز، متعدد انبیاء کے واسطے سے جن کی تعلیمات میں آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ ان سب کا مقصد تمام لوگوں کو عقیدۂ توحید پر جمع کر دینا ہے۔ تاہم مذہب کی روح اور مذہب کے خارجی اظہار میں مولانا نے امتیاز کیا۔ ان کے خیال میں قرآن کی تعلیم یہ ہے:

مذاہب کا فرق روح کا یا دین کا فرق نہیں ہے، یہ تو صرف مذہب کے خارجی

---

[۱] ترجمان القرآن: ۳۴۵۔ ۳۴۴ ایضاً: ۳۴۵

اظہار کا فرق ہے، شرع اور منہاج کا فرق ہے، اور یہ تفریقات فطری ہیں، کیونکہ مختلف زمانوں اور مختلف سماجی حالات کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔

خدا کی توحید کا خیال اور اس کے ذریعہ انسانیت کی وحدت کا خیال حریت قومی کی تحریک میں مولانا آزاد کے رویہ کی خاص نظریاتی اساس بن گئی۔

ان کے فلسفیانہ اور سیاسی نظریات کا پورا اظہار الہلال اور البلاغ میں ہوا ہے۔ الہلال کی اشاعت ان لوگوں کے لیے جو علی گڑھ تحریک کے پیرو تھے، ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعاون کی علمبردار تھی اور اسی میں انھیں ملتِ اسلامیہ کی نجات نظر آتی تھی۔ برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا انکار کر کے مولانا نے دبستان علی گڑھ سے پہلا قدم ہٹایا۔ اگلا قدم بھی اتنا ہی اہم تھا: تنگ نظر مذہبی قومیت کا انکار جو فرقہ پروری کی صورت اختیار کرتی تھی اور قومی تحریک کو کمزور کرتی تھی۔

مولانا کے افکار کے ارتقا میں دس سال کا عرصہ لگا۔ اس وقت الہلال کے صفحات پر وہ مسلم قوم پرور کی حیثیت سے گفتگو کرتے تھے اور سیاست اور مذہب کو ایک غیر منقسم اکائی سمجھتے تھے۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں ایک مراسلہ نگار کو انھوں نے جو جواب لکھا ہے وہ اس عہد کے ان خیالات کا عمدہ ترجمان ہے۔

"(آپ کا خیال ہے کہ سیاست کو مذہب سے علیحدہ ہونا چاہیے لیکن اگر ہم یہ مان لیں تو پھر ہمارے لئے بچا کیا ہے ہم نے اپنی سیاسی فکر مذہب ہی سے نکالی ہے) ..... ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو، وہ ایک کفر صریح ہے۔"

اس وقت مولانا نوآبادیاتی نظام کے خلاف مشترک جدوجہد کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اتنی محسوس نہیں کرتے تھے۔ برخلاف اس کے وہ دونوں فرقوں کی سیاسی علیحدگی کی تلقین کرتے تھے۔

"آپ پوچھتے ہیں کہ آج کل ہندوؤں کے دو پولیٹیکل گروہ موجود ہیں ان میں سے آپ کس کے ساتھ ہیں۔ گزارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں، بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں۔۔۔۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔۔۔۔ (وہ تو دنیا کے رہنما تھے، اگر وہ خدا کے سامنے جھک جائیں تو کائنات ان کے عزم کے سامنے جھک جائے گی)۔"[۵۰]

آزاد نے قومی اتحاد کے مقابلے میں مسلمانوں کے مذہبی اتحاد کو ترجیح دی اور ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ مسلمان بنیادی طور سے عالمی مسلم برادری کا شہری ہے۔ ۱۹ویں صدی کے آخر اور ۲۰ویں صدی کے آغاز میں پان اسلام ازم دنیائے اسلام میں پھیلا ہوا تھا۔ آزاد کے یہاں یہ اسی کا اثر تھا۔ ہندستانی مسلمانوں میں آزاد سے زیادہ کسی نے جمال الدین افغانی کے پان اسلامی نظریہ کی حمایت نہیں کی۔ اقبال کے برخلاف جنھوں نے افغانی سے اثر پذیری کے باوجود پان اسلام ازم کو خلافت کے دفاع کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا، آزاد کا عقیدہ تھا کہ خلافت کے ساتھ سیاسی وفاداری اور تمام مسلمانان عالم کی اس کے حضور مکمل اطاعت گزاری پان اسلامی سماج کا ستون ہے۔ اور یہ خلیفہ کے حضور ملت کی اطاعت گزاری مذہبی نہیں سیاسی نوعیت کی ہو۔ کیونکہ ہدایت و راہنمائی تو خدا اور اس کے رسول کا منصب ہے۔ مگر ایک اہم بات کا آزاد نے یہاں لحاظ رکھا ہے: یہ کہ یہ سیاسی وفاداری اس وقت تک مطلق نوعیت رکھے گی

---

[۵۰] الہلال: ۸ ستمبر ۱۲ء / ۲۹ دسمبر ۱۲ء

جب تک خلیفہ قرآن اور سنت کی تعلیمات پر عامل رہے گا (مسئلۂ خلافت: ۲۰-۲۵)

مذہبی قوم پرستی اور بعض اعتبار سے اسلامی علیحدگی پسندی کے لیے آزاد کے جوش و جذبہ کی تحقیر مقصود نہیں ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ وہ افکار نہیں تھے جنھوں نے انھیں مقبولیت عطا کی۔ الہلال و البلاغ نے برطانوی تسلط کے خلاف جو جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا، اصل میں اس نے انھیں مقبول بنایا، چنانچہ ۱۹۱۴ء میں الہلال بند کر دیا گیا اور یہی اس کے جانشین البلاغ کے ساتھ ہوا۔ خود آزاد کو بنگال بدر کر دیا گیا۔ پنجاب، دہلی، یوپی اور بمبئی کی حکومتوں نے اپنے اپنے صوبوں میں ان کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ اپریل ۱۹۱۶ء کے اواخر تک وہ رانچی میں نظر بند رہے۔ نظر بندی کا یہ دور آزاد کے افکار کی تشکیلِ نو کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا، جس میں انھوں نے پچھلے تصورات پر نظرِ ثانی کی۔ یہ اصل میں اثر تھا ہندوستان میں جو مختلف واقعات رونما ہو رہے تھے، ان کا، اور قومی تحریک نے جو تشدد پسندانہ انداز اختیار کر لیا تھا، اس کا۔ ان کے افکار میں کٹر اسلامی قوم پروری سے — برطانوی تسلط کے خلاف ہندو مسلم تعاون کے نظریے کی جانب آخری اور فیصلہ کن موڑ لانے میں اُس رویے سے بھی مدد ملی جو انڈین نیشنل کانگریس نے خلافت کی جانب اپنایا تھا۔

سامراج کے خلاف جس نے سلطنتِ عثمانیہ اور ترکی سلطان کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا تھا "خلافت تحریک" شروع ہوئی تو اس میں صرف مسلمان ہی نہیں وہ سب لوگ شریک ہو گئے جو عام طور سے سامراج کے مخالف تھے۔ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں کانگریس نے خلافت تحریک کے ساتھ اپنے مکمل تعاون کا اظہار کیا اور ترکی اور دوسرے مسلمان ملکوں پر سامراجی جارحیت کے خلاف بڑے پیمانے پر عوامی ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔

مذہبی قوم پروری سے سیکولر یورژوا قوم پروری کی جانب مولانا آزاد کے اندازِ نظر کی تبدیلی یا ارتقار میں ایک بڑا حصہ ان واقعات کا بھی تھا جو ترکی اور دُنیائے عرب میں رونما ہو رہے تھے؛ خصوصاً اتاترک کے ہاتھوں خلافت کے خاتمے — اور اس عرب قوم پرستی کے تقویت پکڑنے سے جو عربوں کی تہذیب، وطن، زبان اور تاریخ کی وحدت پر مبنی تھی!

۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کانگریس کی مجلس عاملہ کے ممبر ہو گئے، اور پھر ساری عمر پارٹی کے لائقِ احترام لیڈروں میں گنے جاتے رہے، اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کرتے رہے۔ قومی تحریک میں جو نئے موڑ آئے انھوں نے مولانا کو یقین دلا دیا کہ اس کی کامیابی کے لیے سب سے ضروری چیز تمام ہندستانیوں کا اتحاد ہے، مذہب، زبان یا کسی بھی اختلاف کا لحاظ کئے بغیر! وہ بجا طور پر سمجھتے تھے کہ نام نہاد فرقہ وارانہ مسئلہ ہندستان کی آزادی کے بعد حل کیا جانا چاہیے — اور حل ہو سکتا ہے؛ اور یہ کہ مذہبی بنیاد پر ملک کی تقسیم مسئلہ کو سلجھا نہیں سکے گی، بلکہ ہندو مسلم عناد کو اور زیادہ شدید بنا دے گی! انڈیا ونس فریڈم میں ایک جگہ کہتے ہیں:-

"ایک دوسرے کے مقابل دو ریاستیں — ایک دوسرے کی اقلیتوں کا کوئی حل نہیں پیش کرتیں؛ انھوں نے تو یرغمال کا ایک نظام وجود میں لا کے، بدلے اور انتقام کی راہ کھول دی ہے[۵]۔"

اپنے بہت سے ہم وطنوں کے برخلاف مولانا کے نزدیک ہندو مسلم اور تمام فرقہ وارانہ آویزشوں کی بنیاد مذہبی جذبات نہیں، بلکہ سماجی، اقتصادی اسباب ہیں۔ انڈیا ونس فریڈم ہی میں کہتے ہیں:-

---

۵ انڈیا ونس فریڈم: ص۲۴۸

"ملک کا اصل مسئلہ اقتصادی ہے نہ کہ فرقہ واری۔ اختلافات طبقات کے ہیں، نہ کہ فرقوں کے۔ آزادی کے حصول کے بعد (اب) ہندو مسلمان اور سکھ سب مسائل کی اصل نوعیت کو سمجھ لیں گے اور اختلافات حل ہو جائیں گے۔" (ص ۱۸۴)

تقسیم کے بعد ــــ جو بین الاقوامی اثرات ہونا تھے ــــ وہ مولانا کی دوربین نظر میں تھے، اس لیے انھوں نے اتحاد اور ملک کی تقسیم کی قیمت پر آزادی کے حصول کی شدت سے مخالفت کی :۔

"اگر کوئی فرشتہ بلند آسمانوں سے اتر کے آئے، اور قطب مینار کی بلندیوں سے پکارے کہ ہندو مسلم اتحاد کو ختم کر دو اور پھر ۲۴ گھنٹے کے اندر سوراج تمھارا ہے، تو میں ایسے سوراج کو ٹھکرا دوں گا۔ یہ سوراج کا ٹھکرانا صرف ہندستان پر اثر ڈالے گا جب کہ ہمارے اتحاد کا خاتمہ پورے عالم انسانی کا نقصان ہوگا۔" (ابمبیر: میموریل جلد: ۴۹)

دو قومی نظریہ کو انھوں نے مسترد کر دیا تھا جو تقسیم ملک کے مطالبے کے لیے مسلم لیگ کے لیڈروں نے پیش کیا تھا۔ مولانا جو اپنی جوانی کے زمانے میں اپنی تحریروں اور تقریروں میں مسلمانوں کی علیحدگی، دوسرے مذہب والوں پر اور خاص کر ہندوؤں پر ان کی برتری، اور خالص اسلامی طریق زندگی، دین کو اپنانے پر زور دیتے تھے ــــ اب وہ ہندو مسلمانوں کی مشترک تقدیر کی بات کر رہے تھے : مشترک سماجی اور سیاسی مقاصد کی بات جو صدیوں کی ملی جلی زندگی نے ان کے لیے مقدر کر دیے تھے۔ رام گڑھ کی صدارتی تقریر میں انھوں نے اس کی بالکل وضاحت کر دی :۔

"ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت،

ہمارا مذاق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی چھاپ نہ لگ چکی ہو۔۔۔ یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے۔"[1]

آزاد کے ناقدوں کو ان کے یہاں تضاد نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے آخری دور میں آزاد کے سماجی، سیاسی تصورات، جوانی کے زمانے سے بہت مختلف تھے لیکن یہ تضاد ذہنی ناہمواری Inconsistency کی دلیل نہیں! اسے تو صرف ان کے خیالات کے منطقی ارتقا کا پتا چلتا ہے جو ہندستانی سماج کے بدلتے ہوئے حالات سے اثر پذیر ہو رہے تھے۔ ایک بار پچھلے معتقدات کو مسترد کر دینے کے بعد آزاد نے مضبوطی اور جرأت مندی کے ساتھ اپنے ان نئے معتقدات کو پیش کیا جو زندگی بھر کے تجربے اور جد و جہد کے نتیجہ میں ان کے ذہن میں رچے تھے۔

ان کا تصور قومیت ایک سرزمین کے رہنے والوں اور ان کی تاریخ اور تہذیب پر مبنی تھا۔ انھوں نے بتایا کہ انسانی تعلقات اور اجتماعی احساسات کے ارتقا میں قوم برادری کا درجہ سب سے اونچا ہے یہ، مثلاً خاندانی تعلقات، یا ایک گاؤں، ایک شہر اور ایک ضلع والوں کے آپس میں ایک دوسرے کے لئے جذبات و احساسات سے بالا و برتر جذبہ ہے۔ اپنے نظریہ قومیت کی وہ کوئی باقاعدہ تعریف نہیں کر پائے لیکن ان کی تقریروں اور تحریروں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ قومیت کو ایک خطہ زمین اور تاریخی حیثیت رکھنے والے فرقہ سے متعلق کرتے تھے۔ اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ آزاد نے قومیت کی دو اقسام جارحانہ اور دفاعی میں فرق کیا ہے۔ یوروپی

---

[1] بیدار: "مولانا ابوالکلام آزاد": ۲۷۵

اقوام کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ:

"اگرچہ قوم پرستی آزادی اور انسانی حقوق کے دفاع کے لیے پیدا ہوئی تھی، مگر بعد میں وہ انھیں دو مقاصد کے حصول کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی"۔ (عبدالوحید خاں: انڈیا ونس فریڈم - دوسرا رخ: ۳۰)

اس طور پر انھوں نے بورژوا قومیت کی تعمیر میں جو خرابی مضمر ہے اُسے بجا طور پر دیکھ لیا تھا، مگر اس کے صحیح اسباب وہ نہیں سمجھ پائے!

آزاد کی توجیہات کے مطابق قومیت اگر جارحانہ نہ ہو تو اسلام کے خلاف نہیں ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام اس سے آگے کے دو مرحلوں کو بھی جانتا اور مانتا ہے۔ یعنی: ایک مذہب سے وابستگی جو مختلف ممالک اور اقوام کے لوگوں کو متحد کر دیتی ہے، اور — اعلیٰ ترین انداز کی ملت جو عالمی انسانی برادری سے تعلق کے ساتھ وجود میں آتی ہے! اور اگرچہ اسلام کا آخری مقصد اسی اعلیٰ ترین منزل کو پانا ہے، مولانا کے بقول اسلام صرف اول الذکر منزل تک پہنچ پایا جو عہدِ وسطیٰ کی خلافت کی شکل میں وجود میں آئی تھی!

اپنی عمر کی آخری دہائی میں وہ عالمی شہریت کے خیال کو تحریروں اور تقریروں میں دُہرانے لگے تھے۔ ان کے خیال میں جغرافیا اور تاریخ پڑھانے کے طریقے کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ "دنیا اور انسانیت کے اتحاد" کی منزل تک پہنچا جا سکے۔

'یونسکو سے تعاون کے لئے انڈین نیشنل کمیشن' کے دوسرے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں مولانا نے لکھا ہے: "ابتدائی درجوں میں بچوں کے لئے ہمیں نئے نقشے چاہئیں، جن میں تمام دنیا ایک رنگ میں دکھائی گئی ہوگی؛ ہمیں بچہ کو بتانا چاہئے کہ وہ سب سے

---

[1] انگریزی تقاریر ۱۹۴۷-۱۹۵۵: ۱۵۲

ہیں تو دنیا کا شہری ہے؟ اس کے بعد اسے یہ بھی بتایا جائے کہ جس طرح ایک شہر کو سہولت کے لئے محلّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اسی طرح دنیا ایشیا، امریکا، افریقا اور یورپ کے حصوں میں منقسم ہے، لیکن یہ تقسیمیں دنیا کی اکائی کو ختم نہیں کر دیتیں[۱]۔ یہ عالمی شہریت کا تخیل آزاد کے وحدت ادیان اور توحید کے نظریہ پر مبنی اور منطقی طور سے اس سے متعلق تھا۔ یہ عجیب و غریب اور رائف لیلوی قسم کی توقع تھی کہ دنیا کی آویزشیں تعلیمی میدان میں اصلاحوں سے اور تہذیبوں کے مل جانے سے حل ہو جائیں گی!

آزاد نے نہ صرف مختلف مذاہب کی وحدت اور بقائے باہم کے اصول کی ضرورت سمجھانے کی کوشش کی، بلکہ اس کی بھی کوشش کی مشرق اور مغرب کی تہذیبوں میں یکسانیت کے نکات پر زور دے کر مشرق اور مغرب کی نام نہاد آویزش کو بھی ختم کیا جائے۔ ان دونوں تہذیبوں میں جو فرق ہے، اسے انھوں نے اس طور پر ظاہر کیا کہ کون ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر کتنا زور دیتا ہے۔ مولانا کے بقول یونانی فلاسفہ کے وقت سے مغرب نے اس امر پر زیادہ توجہ رکھی کہ انسان کیا کرتا ہے نہ کہ اس پر کہ انسان کیا ہے! اس کے مقابلے میں مشرق، انسان کی اندرونی روحانیت پر زور دیتا رہا۔ مشرقی تصور کے مطابق خدا کا مظہر سمجھے بنا انسان کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ مولانا کا خیال تھا کہ مشرقی اور مغربی دونوں تصورات انسان کو سمجھنے میں یک طرفہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ مشرقی تصور اسے بہت اونچا درجہ دیتا ہے؛ اور قرآن تو اسے "خلیفۃ اللہ علی الارض" کا درجہ دیتا ہے؛ اس طور پر انسان تخلیق کا شاہکار بن جاتا ہے۔ لیکن یہی تصور، مولانا خود کہتے ہیں کہ جبریت کے عناصر بھی اپنے میں سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اگر انسان خدا کا مظہر ہے تو وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، بالآخر، خدا کی مرضی سے کرتا ہے؛ نتیجۃً یہ انسان کو محض تقدیر کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بنا

---

۱ انگریزی تقاریر: ۱۵۰-۱۵۱-

بنا دیتا ہے۔ اور یہاں پہنچ کر عملاً مولانا کو اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ مذہبی مابعد الطبیعات کے دائرہ میں رہ کر الوہیت کے مسئلہ کو سمجھنا ناممکن ہی ہے!

مشرقی تصورِ انسان میں مولانا کو ایک اور نقص بھی ملا ہے کہ: خالق و مخلوق میں اتحاد پر زور دیکر یہ تصورِ انسانی مصیبتوں کی طرف سے ہمیں لاپروا کر دیتا ہے جو سب محض 'حلقۂ دام خیال' ہو جاتی ہیں' اور ان کے بقول یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ "مشرقی طرزِ فکر میں بسا اوقات سماجی فلاح اور ترقی کی جانب قابل لحاظ توجہ نہیں ملتی" [۱]

اس کے برخلاف مغربی تصور میں سماجی ترقی پر زور ہے، جسے انسانی سماج کے ہر رکن کی ذاتی کوششوں کے نتیجہ میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ مغربی تصور میں انھیں انسان کے روحانی پہلو کی طرف عدم توجہ کی کمزوری نظر آتی ہے:

"اگر ہم انسان کے بارے میں محض ایک ترقی پذیر جانور کا تصور اپنا لیں تو دوسرے جانوروں میں اور اس میں جو مشترک جذبے پائے جاتے ہیں۔ ان کی تسکین کے لئے سائنس کے استعمال کو اسے کوئی نہیں روک سکے گا" [۲]

مولانا کا خیال تھا کہ انسانیت کی نجات مشرقی اور مغربی تصور کی آمیزش میں ہے:

"اگر مغربی سائنس کے کارنامے اس مشرقی ماحول میں کام میں لائے جا سکیں، جہاں انسان اور خدا کے قریبی رشتے قائم ہیں، تو سائنس تباہی کا آلہ بننے کے بجائے انسانی ترقی، امن اور خوشحالی کے استحکام کی خدمت گذار بن سکتی ہے......" [۳]

آزاد جسے مشرقی اور مغربی تصورِ انسان کہتے ہیں — یہ دراصل انسان کی

---

[۱] انگریزی تقاریر: ۸۵ [۲] ایضاً: ۸۷ [۳] ایضاً

مادّی اور عینی توجیہات ہیں۔ یہ کہنا کہ مشرق نے ہمیشہ انسان کے بارے میں عینی تصور رکھا ہے، اس کے یہ معنی ہوں گے کہ تمام مادیتی عناصر کا انکار کر دیا جائے، جو واقعتہً مشرق کے فلسفیانہ افکار میں موجود ہیں۔ دوسری طرف مغرب کے فلسفیانہ نظریات کو بھی محض مادیت میں سرسری طور سے اس کے معتبر معنی کے ساتھ خلاصہ کر دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عینیت بڑی حد تک مشرقی افکار کا اہم حصہ ہے، اور مادیت مغربی افکار میں خاصی پھیلی ہوئی ہے، لیکن یہ بات غلط ہو گی کہ اگر ہم عینی فلسفہ کو خالص مشرقی اور مادّی فلسفہ کو خالص مغربی قرار دے ڈالیں۔

مولانا آزاد کی انسان کے بارے میں مشرقی اور مغربی تصورات کو آمیز کرنے کی خواہش اصل میں اسی عینیت اور مادّیت کو ملانے کی خواہش ہے۔ اس آمیزش کی ضرورت کے نتیجہ پہ خود مولانا آزاد جس طرح پہنچے وہ نتیجہ ہیں ان کے خیالات کے مسلسل ارتقا کا: مذہبی نظریہ کی مطلق پیروی سے، مادیت کی بھی کچھ خوبیاں روشن ہو جانے تک!

عابد رضا بیدار

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

ایک دوست نے سپرو ہاؤس میں ایک روز مجھ سے پوچھا تھا:
"اس وقت تمہارے یہاں مسلمانوں کا ایسا لیڈر کون ہے جسے سارے ہندستان کے مسلمان مانتے ہوں"
ذکر کچھ سماجی اصلاحات کا تھا اور اسی سلسلہ (کنٹیکسٹ Context) میں یہ بات بھی پوچھی گئی تھی: یعنی ایسا شخص جو مسلمانوں میں جدیدیت (MODERNISM) کو اپنے کردار اور شخصیت کے جادو سے قبول عام دلا سکے! اگر میں عمومی طور سے بھی کچھ سوچنے لگ گیا۔

آزادی کے بعد رفیع احمد قدوائی کے علاوہ ایک تنہا نام ابوالکلام آزاد ہی کا تھا اور ہے جو انڈیا ونس فریڈم کے باوجود بلا امتیاز مسلک و ملت ہر ہندستانی کے لئے کم و بیش یکساں محترم بنا رہا ہے۔ اور اگرچہ بس پانچ فیصد مسلمانوں کی ایک تعداد ایسی بھی ضرور رہی جو ان کو اس مضمون کے خط بھی لکھا کرتے تھے:

ترے بلند مناصب کی خیر ہو یارب! کہ جن کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک

لیکن مجموعی حیثیت سے وہ متفق علیہ ہی نہیں، راستے کی تنہا مشعل بھی بن گئے تھے اور ایک بہت بڑا سہارا بھی۔ اس احترام و عقیدت کے کچھ وجوہ ہیں؛ ان کے فکر و عمل کے کچھ پہلو ہیں، جو عام طور سے کمیاب رہے ہیں۔

آزادی سے پہلے ایک طویل صبر آزما جنگ کے انتھک سپاہی — اور آزادی کے بعد ملک کی بے لوث خدمت اور دانشمندانہ قیادت! یہ ان کا ایک پہلو تھا۔ اتحادِ فکر و عمل، استقامت و پامردی، اور اپنے مشن سے بیکراں عشق! ایک پہلو یہ تھا: مذہبی عالم ہوتے ہوئے، مذہبی تنگ نظری، اور خود اچھا مسلمان ہوتے ہوئے عملِ صالح اور توحیدِ ذاتِ برتر کے قائل و عامل غیر مسلموں کو جہنم کی بشارت دینے سے اجتناب! یہ تیسرا پہلو تھا۔ اور اچھے ہندستانی ہوتے ہوئے قدیم ہند کے ورثہ کے ساتھ ساتھ عہد وسطٰی کے ہند اسلامی کی دین کو بھی اتنی ہی اہمیت کا مستحق ٹھہرانا، اور نتیجہ میں: اک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کو ہندستان کی ناگزیر تقدیر سمجھنا جس میں گپھائیں بھی ہیں، دہار بھی، منار بھی! قدیم ہند کی ساری عظمت بھی، عجم کا حسنِ طبیعت بھی، عرب کا سوزِ دروں بھی!

بڑی شخصیت اور بڑے افکار محض دنیاوی موت سے فنا نہیں ہو جاتے؛ ان کے اصل قاتل ان کے پستہ قد اور کم نظر وارث ہوتے ہیں جو اپنے پیشرو سے نہ روشنی حاصل کر سکتے ہیں، نہ گرمی۔ اگرچہ سننے والوں کو ان کی آواز کئی موقعوں پر سرگوشی کرتے سنائی بھی دے جاتی ہے کہ

گاہے گاہے باز خواں این قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

وہ طبقہ جو مسلمانوں کو بدستی ملیچھ سمجھتا ہے اور ہندوؤں کو نجس کافر، اس سے

مجھے کچھ نہیں کہنا۔ لیکن وہ جو سب سے زیادہ ترجیح اس امر کو دیتے ہیں کہ اس ملک کو جمہوریت، سماجی انصاف اور سیکولر اقدار کی استوار پائدار بنیادوں کے ساتھ ایک خوشحال ریاست بنانا ہے، اور انسانیت بھی ساتھ بڑی سے بڑی وفاداری کو بھی قربان کر دیتا ہے ——— ان کے لئے نئے ہندستان کے معماروں میں افکار کا جہاں تک تعلق ہے جواہر لال اور ابوالکلام صرف دو سے پوری رہنمائی مل سکتی ہے، جن کا مذہب کا تصور عالمگیر انسانیت سے سب سے زیادہ قریب تھا، اور جن کا تہذیب کا تصور قدیم و جدید اقدار کا حسین امتزاج!

مولانا آزاد کے بعد کانگریس نے حافظ ابراہیم کو سرکاری طور سے وہ درجہ بخش تھا، لیکن قد و قامت کی بھی کچھ بات ہوتی ہے! ایوانِ حکومت سے ہٹ کے عوامی سطح پر مولانا حفظ الرحمٰن ایک بڑی حد تک مولانا آزاد کی کمی پوری کرتے رہے، لیکن انھیں بہرحال ہی مزید کام کی مہلت مل سکی، اور پھر وہ بھی مولانا آزاد کے اور اپنے خالق سے جا ملے۔ ایوانِ حکومت میں اس عرصہ میں ہمایوں کبیر کے آنے کے بعد ایک شستہ، ایماندار، جرأت مند، اور دانشور مسلمان نمائندہ سامنے آیا، جس کا امیج ابھرنے لگا تھا۔ اوقاف کو قومی بہتری کے لیے استعمال میں لانے کی تجویز، مسلم پرسنل لا پر ہمدردی، لیکن دیانت سے غور و خوض کا سلسلہ، تہذیب اور مذہب کا وہی مولانا آزاد والا متوازن تصور، اور پھر ہر طبقہ میں محترم و مخدوم! لیکن حکومت کی کایا پلٹ میں وہ جب ایوان سے باہر ہوئے تو بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے بے لگام کارواں کی طرف ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لیتے، وہ سیدھے کانگرس مخالف کیمپ میں پہنچے، جہاں انھیں ہائی کمانڈ میں شامل کر لیا گیا۔ اور پھر سیاست کا نشہ چڑھتا چلا گیا!

چھاگلہ صاحب (اور ان کے دوست علی گڑھ کے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ) بظاہر ایماندار اور نیک نیت ہونے کے باوجود اس بات کو نہیں سمجھ پائے کہ موقع محل اور رموز و وقت کی بھی ایک اہمیت ہوتی ہے! اور، حکومت میں آزاد، ابراہیم،

کبیر اور بچھا نگہ صاحبان کے موجودہ جانشین فخرالدین علی احمد صاحب کو ابھی تک وہ مواقع نہیں ملے کہ اپنا کل ہند امیج بنا سکیں۔ حالانکہ کبیر کے بعد اور ایک لحاظ سے اُن سے بھی زیادہ، ان کے اندر کچھ ایسی خصوصیات ہیں کہ اپنی متوازن طبیعت کے لحاظ سے یہ اس خلا کو پُر کر سکتے ہیں (اور کانگرس ہائی کمانڈ کو ابھی چند سال پہلے مسلمانوں کی شکایات پر انھوں نے جو رپورٹ پیش کی تھی، اُسے پڑھ کے تو انصاف پسندی، جرأتمندی دونوں کا یقین سا آنے لگتا ہے)۔

ایوانِ حکومت سے ہٹ کے قیادت کا ایک اور اہم سرچشمہ علی گڑھ ہے۔ اور اسے ایک عجیب اتفاق ہی کہیے کہ جب پہلی سطح پر ایک منارۂ نور چمک رہا تھا، تو اس کے متوازی، علی گڑھ کو بھی شاید اسی قد و قامت کا، اور بعض اعتبار سے اس سے بھی بلند قد، سالارِ کارواں مل گیا تھا، جس کے پیچھے ربع صدی کی بے غرض، انوکھی اور بیمثال خاموش قومی خدمت کی تاریخ تھی؛ اور جسے کوئی ایک فرد بھی اُس قسم کا خط لکھنے کی بات نہیں سوچ سکتا تھا وہ جو کسی نے مولانا کو لکھا! یہ ذاکر صاحب تھے، جنھوں نے آٹھ نو سال تک علی گڑھ کے ذریعہ چالیس پچاس ہزار نوجوانوں کو براہِ راست اور چالیس پچاس لاکھ کو بالواسطہ وہ کچھ دیا جو وہ چاہتے تھے، اور وہ سب کچھ سکھا دیا جو انھوں نے زندگی سے سیکھا تھا۔ ذاکر صاحب کا نام اس وقت پورے ہندستان کے لئے جادو کا اثر رکھتا تھا، اور وہ عالم و عامی، مذہبی و لامذہبی ہر شخص کے لیے محبوب و محترم بن چکے تھے۔ شخصیت کی ایسی دلآویزی ۱۹۵۶ء کے بعد کسی میں دیکھنے میں نہیں آئی؛ یہ وہ سال تھا جب ذاکر صاحب نے علی گڑھ کو خیرباد کہا!

پنڈت جی آزاد لائبریری کا سنگ بنیاد رکھنے آئے ہوئے تھے، میرے ہاتھ میں سُرخ گلاب تھا۔ پاس سے گزرے تو میں نے ان کی طرف اُچھال دیا اور جلدی جلدی

وظیفہ کی طرح دل میں دُہرانے لگا: پنڈت جی علی گڑھ کے پاس گلاب ہے' اور ذاکر صاحب ہیں؛ گلاب آپ کی نذر ہے، ذاکر صاحب کی نذر نہ مانگیے گا ہم سے! مگر ہونی ہو کر رہی؛ اور ذاکر صاحب جس خاموش خدمت اور لگن کے آدمی تھے اِس قطعی نئے ماحول میں' اب اُن سے کوئی ویسی مانگ ہی غلط تھی!

ذاکر صاحب کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی علی گڑھ پہنچے؛ ایک عرصہ دراز کا ریاست رام پور کی وزارت عظمیٰ کا انتظامی تجربہ ان کی پشت پر تھا۔ رام پور میں ان کے رویہ' کارکردگی' اور مجموعی شخصیت کے بارے میں رائیں مختلف سہی' لیکن علی گڑھ پہنچ کے انھوں نے جس حسن و خوبی سے اپنا دور گزارا کیا اُسے اب تک یاد رکھا جاتا ہے' تاہم وہ طلبا میں ذاکر صاحب کے انداز کا انسپریشن نہیں بن سکے۔ زیدی صاحب کو مناسب جانشین ملا: بدرالدین طیب جی جن کی طرف سے شروع میں تو لوگ شبہ میں رہے' لیکن پھر تو اسلام میں اگر تھوڑی سی بھی گنجائش ہوتی تو —— طلبا شاید طیب جی کو پوجنے لگ جاتے۔ اتنا بڑا ہیرو تو ذاکر صاحب بھی نہیں بن پائے تھے۔ آخری دنوں میں وہ اپنا ایک کُل ہند امیج بنانے لگے تھے کہ ادھر پنڈت جی کا انتقال ہو گیا؛ اور تہذیبی پالیسیوں میں یک دم انقلاب سا آ گیا۔ طیب جی کو خاموشی سے ملک سے باہر بھیج دیا گیا؛ اور علی گڑھ نواب علی یاور جنگ کو سونپ دیا گیا۔ نواب صاحب کا دور علی گڑھ کے تاریخی تسلسل میں تو شاید مناسب ہی تھا کہ طیب جی کے بعد SHOCKS کی بھی ضرورت تھی' لیکن اس سے ایک قومی نقصان یہ ہوا کہ قیادت کا تسلسل ٹوٹ گیا؛ اور اب سنبھلنے سنبھلنے ہی میں مدت لگ جائے گی! شاید اسی سبب سے ذاکر صاحب کے دبستان کے ہوتے ہوئے بھی نئے وائس چانسلر ڈاکٹر سعید العلیم کو کوئی ایک راستہ صاف نہیں مل رہا ہے؛ راستہ بنانا پڑے گا۔ لیکن اس عرصہ میں گنگا جمنا کے پلوں کے نیچے کتنا پانی بہہ چکا ہو گا!

علی گڑھ کا ذکر میں نے اس لئے کیا، اور اس تفصیل سے کیا، کہ یہ دوسرا سرچشمہ بھی مختلف وجوہ سے، ابتک، قیادت بخشنے میں ناکام رہا۔

جہاں تک مسلمانوں کی تہذیبی، مذہبی یا سیاسی اور نیم سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے مسلم لیگ تو جنوب کی جماعت ہے؛ اس لیے اس کا اور اس کے قائدوں کا سوال کُل ہند سلسلہ میں نہیں اُٹھتا، جماعت اسلامی البتہ اپنی کل ہند تنظیم، اور باقاعدہ دارالاشاعت، ایک اہم اُردو روزنامہ اور ایک اہم ہفتہ وار انگریزی اخبار کے ساتھ اس کی پوری صلاحیت رکھتی تھی کہ کل ہند قیادت سنبھال لیتی، لیکن اس کے حکومت الٰہیہ کے بنیادی نصب العین کو (جسے عام زبان میں اسلامی حکومت ہی کہا جائے گا۔) آزاد ہندستان میں کوئی دانشمندانہ خیال نہیں سمجھا جاتا، اور اسی وجہ سے جماعت کا باقی Image بھی دھندلا ہوتا گیا ہے۔ یہ لوگ اگر UTOPIAN سے زیادہ عملی ہوتے تو سماجی فلاح کے ہزار کام ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انھیں اس کا علم بھی ہے؛ کہیں سیلاب کی آفت آئے، کوئی فساد ہو، کہیں کال پڑ جائے تو یہ جماعت مسلمانوں کی سب جماعتوں سے آگے آگے ہوتی ہے، اور بلا تفریق مذہب و ملت انسانی ہمدردی کا پورا پورا حق ادا کر دیتی ہے لیکن کیا انسانی ہمدردی اور سماجی فلاح کا فرض صرف آفت اور تباہی کے موقع پر ہی عاید ہوتا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی مسلمانوں میں ایک ایسا فرقہ بن کر رہ گئی ہے جسے عجب نہیں تاریخ جلد ہی ہندیہ قسم کا فرقہ بنا کے اپنے صفحات میں چھپالے، جمعیۃ علماء کئی لحاظ سے سب سے معتبر جماعت تھی جو مسلمانوں میں کچھ کام کر سکتی مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی تک اس کا اعتبار حکومت اور عوام دونوں میں قائم بھی رہا، لیکن ان کے بعد بالکل افراتفری ہے۔ پارٹی نے ذاتیات کی اُلجھنوں میں پڑ کے ان کے قریبی ہمنشین اور جنگ آزادی کے آزمودہ سپاہی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو

ذات باہر کر دیا، اور مولانا سعد مدنی مولانا حفظ الرحمٰن کے جانشین قرار پائے۔
نتیجہ میں دونوں صاحبوں کے حواریوں نے ایک سلسلۂ جدال چھیڑ دیا جو سرد جنگ کی
صورت میں اب تک جاری ہے۔ اچھا تو یہی ہوتا کہ دونوں مل کے کشتی کی ایک پتوار
سنبھالتے، تاکہ تاریخ انھیں افتراق کا ذمہ دار نہ ٹھہراتی! اور ایسے وقت میں!!
عوام میں جمعیتہ کا جو اثر تھا وہ بھی رو بہ زوال ہے۔
ایک تیسری جماعت تبلیغی جماعت ہے، اور شاید تعداد کا جہاں تک تعلق ہے
اس کے اثر و نفوذ کا بقیہ تمام گروپ مل کے بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ نہ جمعیتہ کی
طرح سیاست گری کے چکر میں ہیں نہ جماعت کی طرح حکومت الٰہیہ کے خوابوں میں کھو
گئے ہیں۔ یہ تو بس اتنا کہتے ہیں کہ کلمہ یاد کرو، نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکاۃ دو، حج کرو،
ذکر خدا کرتے رہو، جو تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ ایک دوسرے کا لحاظ اور احترام کرو،
اور جو کام کرو بے غرض، بے لوث، صرف اللہ کی رضا کے لئے کرو۔ — اس جماعت میں
سب سے بڑی محترم شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ہے۔ اور — اس طرح ایک
لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے مولانا ندوی وہ شخص ہیں جنھیں اپنے عزیز دوست
کے سوال کے جواب میں پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن محض کثرتِ تعداد کو معیار بنا لینا تو شاید کسی طرح
بھی صحیح نہ ہو۔ اور عجیب بات ہے کہ مذہبی جذبہ رکھنے والے INTELLECTUALS کی اچھی بڑی
تعداد جماعت اسلامی کے زیر اثر ہے مذہبی جذبہ رکھنے والے LAYMAN کی اتنی ہی بڑی تعداد
تبلیغی جماعت سے وابستہ ہے، یہاں دماغ کا نہیں دل کا کام ہے اور اُدھر کبر دماغ کا!
مولانا علی میاں خود عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب، اور عرب دنیا میں ایک معروف
شخصیت ہیں، نقطۂ نگاہ پان اسلامی ہے، اور جن سینوں میں دل جب بھی دھڑکتا ہے
ملت کے لیے دھڑکتا ہے، ان میں سے ایک پُرخلوص سینہ یہ بھی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ
ایک سیدھی لکیر سے ہٹ کے ان کے سامنے نہ کوئی شخص اہمیت رکھتا ہے نہ نظریہ دیگر!

اسلام تنہا وسیلۂ نجات وظفر ہے، اور زندگی گزارنے کا تنہا برگزیدہ طریقہ؛ باقی ہر راہ گمراہ کن ہے۔ اس انداز فکر سے عرب ممالک میں جہاں مسلمان ہی مسلمان ہیں، شاید کام چل سکتا ہے؛ لیکن ایسی جگہ جیسا کہ ہندستان ہے اس قسم کی باتیں کرنا کوئی دانشمندی کا کام تو ہے نہیں۔

مولانائے ندوی کی، ملّت کے شیرازے کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش، جو عربی زبان کے ذریعہ بین المللی سطح پر جاری ہے، قومی سطح پر ۱۹۶۴ء کے لکھنؤ کنونشن کی شکل میں سامنے آئی، جس میں مسلم لیگ، جماعتِ اسلامی اور جمعیۃ علماء کے نمایندوں اور بعض نے فرداً فرداً شرکت کی؛ اور ایک پلیٹ فارم بن گیا جس میں مسلمانوں کی ساری پارٹیاں اتحاد واتفاق کے ساتھ ایک مسئلہ پر متفق ہو گئیں کہ مسلمانوں کے ساتھ اس ملک میں انصاف نہیں ہو رہا ہے، اس لیے ایک متحدہ محاذ سے اس کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے؛ بالخصوص فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے۔ اس محاذ کا نام مسلم مجلس مشاورت رکھا گیا، اور ایک نیم سیاسی تنظیم وجود میں آگئی جس سے عام طور سے توقع ہونے لگی کہ اب یہ تنہا رہنما بن جائے گی۔ اب اس کے نمایاں افراد ابراہیم سلیمان سیٹھ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا ابواللیث ندوی اصلاحی، مولانا محمد اسمٰعیل، مولانا منظور نعمانی، عبدالجلیل فریدی اور ڈاکٹر سید محمود تھے۔ علی میاں بھی شامل رہے، لیکن ان کا اصل کام ان سب کو منظم کرنا تھا؛ پھر دوسرے زیادہ ضروری کام بھی ان کے ذمّے لگے ہوئے تھے۔ اس تنظیم کو وجود میں لانے میں جو امور سب سے بڑے محرک بنے تھے وہ اتفاق سے اس پارٹی کے خلاف پڑتے تھے جو حکمراں تھی۔ اس لیے رفتہ رفتہ ڈاکٹر سید محمود اور بعض دوسرے محتاط لوگ اس سے الگ ہونے لگے۔ اس کا اثر دوسری نہتا پر بھی پڑا؛ ڈاکٹر فریدی نے یو۔ پی یونٹ کو ایک باقاعدہ کانگریس مخالف سیاسی جماعت میں تبدیل کر دیا، اور اس کا نام بھی بدل کر مسلم مجلس رکھ دیا۔

لکھنؤ اس طرح دلی سے ایک طور سے کٹ کے الگ ہوگیا، مرکز کی تنظیم میں اب سرگرم عمل ابراہیم سلیمان سیٹھ تھے، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی تھے، اور جماعت اسلامی۔ لیکن یو۔پی کی مسلم مجلس ہو یا مرکز کی مسلم مجلسِ مشاورت، جس طرح مختلف تاریخی، اور نفسیاتی وجوہ کی بناپر ہندستان میں صرف اسلام' زندہ باد ایک طویل عرصہ کے لیے محض دیوانے کے خواب کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح اس قسم کی منفی تنظیموں سے بھی قیادت کی وہ توقع پوری نہیں ہوتی جس کے لیے نظر کبھی علی گڑھ کی طرف اٹھتی رہی کبھی ذاکر صاحب کی طرف اور کبھی علی میاں کی طرف!

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا، اس قیادت کے لیے غالباً بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ نئی اقدار کا خیر مقدم کرتے ہوئے، نئے ہندستان کی تعمیر میں دلی خلوص اور جوش سے سرگرم عمل ہوتے ہوئے، اسلام اور اسلامیانِ ہند کو بچالے جائے۔ ذاکر صاحب کے بقول "وہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی۔ اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے اور نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے۔ ہندستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے، اور وہ ان کے لیے عیب نہ ہو، بلکہ امتیاز۔"

علی گڑھ شاید نئے ہندستان کو یہ قیادت سکتا تھا لیکن ذاکر صاحب کے وہاں سے چلے آنے کے بعد جیسے وہاں کی دنیا ہی یکسر بدل گئی۔ اُس وقت کے طلبا اپنے کو آنے والی نسلوں کا نبرد اور آزاد تصور کرتے تھے! ۵۶ء کے بعد کے طلبا صرف ملازمتوں کی بات کرتے ہیں!

قوم پرور علما اپنی پشت پر ایک شاندار قومی جدوجہد کی تاریخ رکھتے تھے۔ لیکن دیوبند والوں کے وارث اتنے بونے نکلے کہ سیاست میں درباداری سے آگے

انھیں کچھ سوجھتا ہی نہیں ۔ فرقہ پرور علمار کے سامنے کوئی راستہ کھلتا نظر نہیں آتا۔
سیکولر قوم پرور افراد میں بیشتر اسی درباداری کا شکار ہوگئے ہیں جو علمار کے نصیب میں آئی ۔ بقیہ کا ایک حصہ خاموش تماشائی بنا ہوا ہے ؎

محو حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہوجائیگی

کچھ لوگ پر تول تول کر رہ جاتے ہیں ۔ اور کچھ ایسے ہیں جو زبان یا قلم سے ایک بڑے طبقہ کو مہمیز کرتے رہتے ہیں، لیکن ان کا اثر مختلف وجوہ کی بنا پر منجمد محسوس صورت نہیں اختیار کر پاتا، ہیولی بنتا ہے اور تحلیل ہوتا رہتا ہے۔ تاہم یہ آخر الذکر گروپ ہی ہے جو میرے خیال میں نئی قیادت کا نصف محاذ سنبھال سکتا ہے۔ اس میں فی الوقت میرے پیش نظر صرف دو افراد ہیں: "ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں" کا مصنف؛ اور نورالدین احمد۔ اور لوگ بھی ہوں گے، لیکن ذاتی واقفیت کے ساتھ صرف یہ دو نام لے سکتا ہوں۔ پہلا نام اس لیے کہ پچھلے چند برسوں میں اپنی تحریروں سے اس نے پڑھنے والوں کو جو نظر بخشی ہے اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اور آخری نام اس لیے کہ Frankness، خلوص، دردمندی اور محبت وطن کا جیسا امتزاج میں نے یہاں پایا اور اس کا جیسا صاف، بلند آہنگ اور پُر اعتماد اظہار یہاں ملا، وہ بھی کسی اور جگہ مجھے نہیں مل پایا۔ اور یہاں جس بات پر زور دینا مقصود ہے وہ یہ کہ دونوں[1] افراد بحیثیت افراد کے نہیں بلکہ وہ خصوصیات ہیں جن کی یہ نمائندگی کرتے ہیں:
اس زمین سے شدید پیار، یہاں کے تمام رہنے والوں کی خدمت کا اتھاہ جذبہ اور

---

[1] اسی ہفتہ اخبار میں طیب جی کا بیان دیکھا کہ وہ باقاعدہ اب میدان میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ اگر غلط ہاتھوں میں نہ پڑگئے یا کوئی قیمت نہ لگوائی تو میری فہرست میں شاید ایک تیسرا نام اور بڑھے گا۔

اسلام کے ساتھ لامحدود وفاداری ایک طرف؛ اور ہر قومی مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ فکر اور بلا ایچ پیچ کے ہر رائے کا صفائی کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ اظہار دوسری طرف!

میں نے اس ٹیم کو جو نصف قیادت کہا ہے، یہ جان بوجھ کر کہا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ یہ عمر گزراں کے ۶۰ اور ۷۰ سال کے بیچ کی منزل میں پہنچے ہوئے ہیں؛ اور کئی ایسے امور ہیں جن کے بارے میں یہ اس انداز کا تجزیہ خود نہیں کر پائیں گے جیسے نئی نسل کے لوگ۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی قیادت عمر کے اس تفاوت کی بنا پر قیمتی بھی ہو گی اور ناگزیر بھی۔ یہ ہمیں تجربہ کی روشنی دیں گے اور توازن کا سبق۔ بقیہ نصف قیادت ہمیں تیس اور پچاس کے درمیانی عمر والے گروپ سے ملے گی، جس میں کم سے کم دس نام ذاتی واقفیت کے ساتھ میرے پیش نظر ہیں، جو کسی بھی تنظیم سے وابستہ نہیں ہیں۔

اور علماء کے گروپ میں غالباً دو آدمی اس گروپ کے لیے الگ سے MODERATION کا کام کر سکتے ہیں: مولانا ندوی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی۔

بنیادی طور سے سیاسی توڑ جوڑ سے دلچسپی رکھنے والوں سے زیادہ یہ دانشوروں Intellectuals کا ایک فورم ہو گا جو سیاست کے الٹ پھیر سے زیادہ تہذیب اور اقدار کے بچاؤ کے لئے فکرمند ہیں اور اس قیادت میں وہ سارے عناصر تو ہوں گے ہی جن کا میں بار بار ذکر کرتا رہا ہوں، لیکن سب پر حاوی بس ایک ہی چیز ہو گی جس کے لئے میں ترستا رہا ہوں: صاف گوئی (Frankness)! کوئی خوف، لالچ، لحاظ و وابستگی، تعریف یا تہدید انھیں بلا ملاوٹ بلا اینچ پینچ اور پورا پورا سچ کہنے سے مانع نہ آئے!

اور جب آپ کے پاؤں اس زمین پر مضبوطی سے جمے ہوں گے تو کوئی بھی معقول شخص آپ کی صاف گوئی پر برا نہیں مانے گا، شک اور شبہ نہیں کر سکے گا — اختلاف

کتنا ہی کرے۔

اس قیادت کے دو محاذ ہوں گے، ملی اور قومی۔ ملی سطح پر یہ مسلمانوں کو زیادہ باشعور، زیادہ روشن خیال، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ ہندستانی بنانے کے لیے کوشاں ہوگی؛ قومی سطح پر یہ ہندستانیوں کو زیادہ روادار، زیادہ مہذب، زیادہ وسیع النظر، زیادہ سیکولر اور زیادہ مسلمان دوست بنانے کی جد و جہد کرے گی۔ ملی سطح پر یہ اردو کو ہندستان کی ایک اہم علاقائی زبان بنانے اور منوانے کی کوشش کرے گی، قومی سطح پر یہ ہندی کو ہندستانی زبان بنانے اور ہندی انگریزی جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ ملی سطح پر یہ پچھڑی ہوئی تعلیمی ملت کے لیے خواندگی کی رفتار تیز تر کرنے میں لگے گی، اور علی گڑھ کو اور جامعہ کو آئیڈیل درسگاہیں بنانے کی کوشش کرے گی؛ قومی سطح پر یہ طلبا میں اخلاقی روح پھونکنے اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی جد و جہد کرے گی۔ ملی سطح پر یہ ہر امتیاز اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائے گی۔ قومی سطح پر یہ انتظامیہ کے کرپشن کو جڑ سے اکھاڑنے کی سعی کرے گی۔ ملی سطح پر یہ مثلاً مسلمانوں کے اوقاف کو ملی مصالح کے لیے استعمال کرنے کے حق میں ہوگی؛ مسلم پرسنل لاء میں طلاق، اور دوسری، تیسری شادی کے مسئلہ پر، عورت کو بھی انسان سمجھ کے، اور اتنی ہی ہمدردی کا مستحق جان کے، از سرِ نو غور کرے گی، اس بنیادی شرط کے ساتھ کہ اسلامی قوانین کی توجیہہ و تاویل تو جتنی بھی اور جیسی بھی کی جا سکے، ان کی تدفین ان ہاتھوں سے نہیں ہوگی؛ قومی سطح پر وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرے گی کہ مسلمانوں کا تعددِ ازدواج اس ملک کا اتنا بڑا مسئلہ نہیں، جس سے ایک خیالی دیو کی مانند آپ لوگ سہمے جاتے ہیں؛ اصل دیو تو ان کی جہالت، اوہام پرستی اور تاریک خیالی ہے جو وسیع پیمانے پر ان کے لیے

لیمی سہولتیں دینے کے بنا ختم نہیں ہو سکتی۔ ملی سطح پر وہ مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش
ے گی کہ جس قوم کا ایک بہت بڑا حصہ گائے کو پوجتا ہو ان کے جذبات کا احترام کسی
ی قانون کی رو سے ضروری نہ ہو تو بھی شرافت اور انسانیت کا قانون سب سے بڑا
انون ہے۔ اور اس لئے اس کا لحاظ ضروری ہے اور قومی سطح پر اس آگاہی کو عام
رنا ہوگا کہ مسلمان گوشت خور پیدا نہیں ہوتا، اس کے محدود ذرائع آمدنی اُسے اس
ستی غذا کی طرف مجبور کرتے ہیں؛ یہ بھی کہ اس قسم کے عقائد موجودہ اپا لو، چاند اور
ٹ کے دَور میں میل نہیں کھاتے یہ بالکل ایسا ہی ہوگا کہ کسی مسلمان مُلک میں مولوی
رناتے ہوئے میدان میں نکل آئیں کہ ہر شخص پر داڑھی رکھنا فرض ہے، حالانکہ جو اُسے اچھا
سمجھتا ہو رکھے جو نہیں سمجھتا نہ رکھے۔ رکھنے والے پر نہ رکھنے والے کی ذمہ داری تو بالکل نہیں ہے نا!

ملی سطح پر یہ مسلمانوں کو اپنی زمین سے محبت کے
اب سکھائے گی، قومی سطح پر یہ بین الاقوامی نفع پر قومی وفاداری کو، قومی نفع پر فرقہ
وفاداری کو اور فرقہ کے نفع پر فرد کو قربانی دینا سکھائے گی، اس شرط کے ساتھ
ہر حال فرد بھی ایک زندہ فعال، حساس جزء ہے فرقہ کا، اور فرقہ بھی ایسا ہی فعال
حساس جزء ہے قوم کا؛ اور اس لئے اپنی اپنی جگہ پر ان کا اپنا لحاظ بھی ضروری ہے
ان تک ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ ملی سطح پر یہ ہولی دیوالی کو قومی تیوہاروں کی حیثیت سے لانے
وشش کرے گی۔ قومی سطح پر یہ سمجھانے کی کوشش کرے گی کہ ایرانی مسلمان زرتشتی
ار نوروز کو ایسے ہی جوش و خروش سے مناتے ہیں جیسے پارسی، اس لیے کہ اس میں
انھوں نے خالص مذہبی حصہ کو نکال دیا ہے؛ اور رستم و سہراب کو وہ اپنا ہیرو شمار
تے ہیں اُس لیے کہ ان کے ساتھ کوئی مذہبی بندھن نہیں ہے۔ انڈونیشیا والے اپنے
لامی نام احمد —— کے ساتھ سوکارنو، ڈشیو کرن، اس لیے جوڑ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں
ر کی پوجا کا کوئی تصور ہی نہیں رہا ہے۔

Festivals Minus Religions کہنے کا مقصد یہ ہے کہ
(یا Religious Myths) کر کے سامنے لائے جائیں۔ ان میں جو مذہبی حصہ ہے
وہ مذہب والوں کے لیے رہے لیکن بقیہ کو قومی حیثیت حاصل رہے۔ مسلمانوں کے دونوں
تیوہاروں کے ساتھ بھی یہی رویہ ہوگا۔

لی سطح پر یہ شیعہ سنی افتراق، ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کرے گی؛ قومی سطح پر
یہ ہندستان کے دوسرے مذہبی فرقوں کو اہل کتاب کی تعریف میں لانے کی مفید کوشش کرے گی۔
لی سطح پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ: یہ چھوٹی بات نہیں تھی کہ ہندوستانی
قوم کے ہندو رہنماؤں نے سیکولرزم اور انسانیت کے نام پر ہندو اکثریت کا مسلمانوں
سے انتقام لینے کا فطری اور بنیادی طور پر خوفناک جذبہ ختم کرنے کی کوشش کی، اور
اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے[1] یوں مسائل کہاں نہیں ہوتے سامنے کے
مسائل ختم ہوں گے، ان کی جگہ اور نئے مسائل ابھر آئیں گے۔ یہاں اکثریت یا اقلیت
مسئلہ ہے اگر جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، کیا وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے؟ مسائل کا
مطلب زندگی ہے!

قومی سطح پر یہ واضح کرنے کی کوشش ہوگی کہ اور جو بھی مسئلے ہوں وہ اتنے شرمناک
نہیں ہوں گے جتنے یہ فرقہ وارانہ فسادات، جو انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ ہیں۔ پاکستان
کے لیے اگر کوئی ایک سبب ذمہ دار ہے تو وہ Fear Complex - ایک بار کی
غلطی کو دُہرایئے مت۔ اور جب آپ نے ایک بڑے فرقہ کے اس حق کو تسلیم کر لیا کہ وہ
آپ کی زمین کا ایک بڑا حصہ کاٹ کر بالکل اپنی ملکیت کر لے تو یہ مانتے ہوئے کہ آپ نے
اس طرح اسے ہندستانی بھی مان لیا، موجودہ ہندستان میں رہنے والے مسلمانوں کو باعزت

---

[1] آج ہی شکوۂ ہجراں کا بھی آیا تھا خیال — آج ہی تیری مدارات بہت یاد آئی

طرح سے زندگی کے گزارنے کے حق کو بھی تسلیم کیجئے، اگر وہ اس دیس کو اپنا گھر کہتے ہیں۔[5]
ملی سطح پر یہ ہر قومی مسئلہ کو ملی سمجھنا سکھائیگی اور قومی سطح پر یہ ہر ملی مسئلہ کو قومی مسئلہ!
ملی سطح پر یہ مسلمان Intellectuals کو ایمانداری سے سوچنا سکھائیگی اور قومی سطح پر اس ایمانداری کی قدر کرنا بھی سکھائیگی!!

۱۹۶۷ء کی مئی کا کوئی دن تھا۔ شملہ میں انڈین اسلام پر سیمینار کا سلسلہ جاری تھا ایک صاحب دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی نے ہند و پاک تعلقات بنانے کی ضرورت پر ایک مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر بہار رحمٰن رائے نے مقالہ سننے کے بعد بطور خاص اس بات پر زور دیا کہ یہ افسوسناک ہے کہ اس موضوع پر کسی ہندستانی مسلمان کے قلم سے کوئی تحریر نہیں نکلی۔ میں نے اس پر ڈاکٹر رائے کی توجہ اس دلچسپ خبر کی طرف دلائی جو ہند و پاک جنگ کے زمانہ میں دتی اور آس پاس کے علاقوں میں خوب پھیل گئی تھی کہ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے صوفہ میں چھپا ایک ٹرانسمیٹر دریافت ہوا ہے جس سے وہ پاکستان کو ہند کی اطلاعات بھیجتے تھے اور اور یہ کہ مقالہ نگار بریندر ناتھ کے اصل سرچشمہ یعنی باوا پیارے لال بیدی کے اسی موضوع پر لکھے گئے کتابچہ میں اس واقعہ کا ذکر موجود بھی ہے۔

پتہ نہیں شملہ والوں نے میرے نکتہ کو سمجھا یا نہیں، لیکن اب اس کی توضیح کرتا ہوں۔ کہ ہندستان کے سب سے بڑے مسلمان کو جو کمیونٹی شبہہ سے بالاتر نہ سمجھے وہ عام ہندستانی مسلمان کو ہند و پاک تعلقات بہتر بنانے کی اہمیت پر کوئی مقالہ لکھنے پر کیسے بخش دیگی۔

یہ بات اپنی جگہ ہے۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ہے کہ کسی فکری یا عملی اقدام میں اگر اس کے ملک کی مجموعی بہتری ہے تو ایک بار ایمانداری سے اپنے دل کے سارے گوشوں کو ٹٹول لینے کے بعد پھر ہندستانی مسلمان کو کسی بڑی سے بڑی ناراضگی کی پروا نہیں کرنا چاہئے۔ اور ایماندار مخلص، محب وطن مسلمان کی بھی صاف گوئی اور جرأتمندی کو یہ ملک برداشت

---

[5] دائے کیا شعر کہا ہے مسعود حسین خاں نے ؎ مرے وطن مرے ہندستاں عزیز وطن
تجھے بہشت کہا ہم نے اپنا گھر نہ کہا

نہ کر پایا تو فکر کیجیے، کہ اس کی بنیادیں ہل چکی ہیں !

یہ امر افسوسناک ہے، اور اس کا اظہار اس سے زیادہ تکلیف دہ، لیکن چاہتا ہوں کہ سلسلۂ سخن دراز ہوا ہے تو کوئی ضروری بات باقی بھی نہ رہے۔ اور وہ یہ کہ: اب تک قوم اور قومی پاسبانوں کا رویہ یہ رہا ہے کہ یا تو علماء پر اعتماد کیا جاتا رہا ہے، یا دربارداری کے آداب سے واقف سیکولر مسلمانوں پر۔ پہلا سلسلہ ایک انتہا پر تھا: علماء مخلص اور محبِ وطن تھے، لیکن جدیدیت کے نور سے عاری، اور اس لیے ہر اصلاحی اقدام کے لیے راستے کا ایک بھاری پتھر۔ دوسرے معتمد علیہ طبقہ میں وہ لوگ ہیں، جو عابد صاحب کے بقول "تقسیم ہند سے پہلے وہ انگریزی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نیشنل کانگریس کی مخالفت کیا کرتے تھے، آج حکومت کانگریس کے ہاتھ میں ہے اس لیے اس کی خوشنودی حاصل کرنی ہے . . . خوشامد پسندی حکومت کے لوازم میں سے ہے، اس لیے اکثر اوقات اربابِ حکومت ان قوم پرور مسلمانوں کے مقابلے میں جن کی غیرت انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی کہ خوشامد پر اُتر آئیں، ان مشاق درباریوں پر زیادہ لطف و عنایت کرتے ہیں" علماء کے پاس کم سے کم خلوص اور خدمت کا جذبہ تو تھا۔ تصورات محدود سہی! یہاں تو ذاتی خدمت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

اس لیے اب ضروری ہے کہ ہر سطح پر، اور اسی طرح قومی تقدیر کے کارسازوں کی سطح پر بھی، پچھلے رویّوں پر یکسر، از سرِ نو نظرِ ثانی کر لی جائے۔ بہت دیر ہو چکی ہے، مزید تاخیر خدا جانے کیا دن دکھائے !

———×———

RAMPUR Publications Series (20)

Qawmi Tahzeeb Awr Hindustani Musalman
(National Culture And Indian Muslims)

(2)

The Relevance of Mawlana Azad to Present-day India

Zia'ul Hasan Faruqi
Abid Raza Bedar

Rampur Institute of Oriental Studies
1969